باب دوازدہم

مہران کی وادی میں

وادیءِمہران کے مایہءناز سپوت ذوالفقار علی بھٹو کے اقتدار کی بساط جنرل محمد ضیاء الحق کی سربراہی میں افواجِ پاکستان نے جولائی 1977ء میں لپیٹی۔ آٹھ سال بعد جنرل صاحب اور اُن کے رُفقاء پر یہ انکشاف ہوا کہ صوبہ سندھ کے باسیوں کا احساسِ محرومی ختم کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ایک سندھی سیاست دان کو وزارتِ عظمیٰ کا قلمدان سونپا جائے۔ یہ سعادت مارچ 1985ء سے حُروں کے روحانی پیشوا پیر پگاڑا کے ایک معتقِد اور نسبتاً ایک شریف النفس سیاست دان محمد خان جونیجو کے حق میں آئی۔ دوسرے شعبہ ہائے زندگی کے ساتھ ساتھ اندرونِ سندھ مواصلات کی جُملہ سہولیات کو بھی بہتر کرنے کی کوشش کی گئی۔ محکمہ ڈاک نے اس سلسلے میں اِن علاقوں پر خصوصی توجہ مُرتکز کرنے کے لئے ایک علیحدہ پوسٹل سرکل قائم کر کے حیدر آباد میں اس کا صدر دفتر بنادیا اور راقم الحروف کو یہاں جولائی 1985ء سے پوسٹماسٹر جنرل تعینات کردیا گیا۔

اب وادیءمہران کی ایک تاریخی حیثیت تو بہر حال مُسلّمہ تھی کہ انگریز سرکار نے جولائی 1852ء میں جیکب آباد سے کراچی تک شُتر بردار ڈاک سروس قائم کی۔ اور عوام الناس کی آسانی کے لئے ''سندھ ڈاک'' کے لئے ایشیاء کے اولین ڈاک ٹکٹوں کا اِجراء کیا۔ قیامِ پاکستان کے ساتھ ہی سندھ اور بلوچستان کا ایک علیحدہ پوسٹماسٹر جنرل مقرر کر دیا گیا تھا لیکن اب تو کراچی کے عروس البلاد اور بلوچستان سے جُدا کلہوڑوں اور تالپوروں کی راجدھانی حیدر آباد کو وادیءمہران کی نامہ بری کے مرکز کے طور پر استعمال ہونا قرار پایا۔ ویسے ضیاء الحق صاحب کے جانے کے بعد یکے بعد دیگرے دو عدد وزرائے اعظم صوبہ سندھ ہی سے مقرر ہوئے یعنی محترمہ بےنظیر بھٹو (دسمبر 1988ء سے اگست 1990ء) اور غلام مصطفیٰ جتوئی (اگست 1990 سے نومبر 1990ء)۔

ابھی ہم کراچی میں بیٹھے نئے سرکل کے خدوخال بنانے کی کوشش کر رہے تھے اور عملے اور وسائل کی تقسیم میں مصروف تھے کہ اسلام آباد سے حُکم مِلا کہ ہمیں کراچی میٹروپولیٹن کے پوسٹماسٹر جنرل کی مُلک سے غیر حاضری کے دوران اُس عظیم شہر کی ڈاک سے متعلقہ معاملات کی بھی نگرانی کرنی ہوگی۔ لیجئے یک نہ شُد دو شُد۔ جو کراچی کے گنجلک معاملات میں اُلجھ جائے وہ مزید کیا کرسکتا ہے؟۔ لیکن خوش قسمتی سے حیدر آباد اور اندرونِ سندھ کے دوسرے علاقوں کے مسائل کراچی کے مقابلے میں انتہائی سیدھے سادے نظر آئے۔ اور

وہاں ہمارے رُفقائے کار جن میں ہمارے ڈپٹی پوسٹماسٹر جنرل شیخ قمر جمیل، اسسٹنٹ پوسٹماسٹر جنرل سید تاجن شاہ، اسسٹنٹ ڈائریکٹر ساجد علی صاحب، اکاؤنٹس افسر فاروق صاحب اور اسسٹنٹ انجینئر ظفر صاحب اس سلسلے میں انتہائی مددگار ثابت ہوئے۔ لہٰذا حیدرآباد کو ہفتہ دس دن میں صرف ایک یا دو دن دے کر باقی وقت کراچی کے متعلق امور کے لئے مختص کرنے پڑے۔ اس شہروں کے شہر میں ہمارے سب ہی اہم دفاتر مجتمع ہوگئے تھے۔ یہ شہر اندرونِ مُلک اور بیرونِ مُلک کے لئے وصول ہونے والی ڈاک کے لئے سب سے اہم مرکز کے طور پر استعمال ہورہا تھا۔ پاکستان کے محکمہ ڈاک کے عملے کا ایک مُعتد بہ حصّہ اِسی شہر سے مُنسلک تھا۔ لہذا یہاں کے گھمبیر مسائل سے مُسلسل نبردآزما رہنا ہی پڑتا تھا۔ ایک بڑی تعداد میں ڈاک کے مختلف النوع شعبوں سے وابستہ عملے کے اِس ارتکاز کی وجہ سے یہاں کی سٹاف یونین بھی انتہائی فعال تھی۔ بدقسمتی سے یہاں کی بڑی یونین ''نیشنل آرگنائیزیشن آف پوسٹل ایمپلائیز'' (NOPE) اُن دِنوں دو عدد حریف گروپوں میں بٹی ہوئی تھی۔ لہٰذا عملے کی بہبود کے لئے بھی کام کرنا مشکل تھا۔ کیونکہ دونوں گروپوں کے رہنما محمد ارشد جاوید اور محمد قاسم انتہائی جارحانہ انداز سے ایک دوسرے کی مخالفت پر تُلے بیٹھے تھے۔ حیدرآباد سرکل میں ایک اور ہی یونین کا بول بالا تھا جسکے رہنما خادم حسین اور اُس کے ساتھی مقابلتاً چین کی بانسری بجارہے تھے۔ بہرحال ہمارے پیشرو تجربہ کار مگر سخت گیر افسر پرویز اصغر قریشی کے شروع کردہ مقدمات کو ہم نے اُن کے منطقی انجام تک پہنچایا جس کے نتیجے میں سخت جان یونینز کے کئی سرکردہ اہلکاروں کو اپنی بعض بداعمالیوں کے سبب یا تو ملازمت سے ہاتھ دھونے پڑے یا اُن کے دوسرے دفاتر میں تبادلے کرانے پڑے۔ خُدا بھلا کرے یونین لیڈروں کا کہ اِنہوں نے ہمارے ساتھ باہمی تعاون اور احترام کا سلسلہ قائم رکھا۔ اور ہمیں برسوں سے ناجائز قابضین سے ڈاک خانے کی سرکاری رہائش گاہوں کو خالی کرانے میں کوئی خاص رکاوٹ پیش نہیں آئی۔

کراچی سرکل کے حقیقی پوسٹماسٹر جنرل محمد اقبال صاحب ایک طویل غیرملکی کورس سے فارغ ہوکر واپس آئے تو اُن کی امانت اُن کے حوالے کر کے ہم حیدرآباد سدھارے۔ اور پہلی دفعہ ہمیں احساس ہوا کہ ہم روشنیوں کے شہر کو چھوڑ کر ایک نسبتاً خوابیدہ مگر پُرسکون ماحول میں آگئے ہیں۔ جہاں سندھی ثقافت وتہذیب سے براہِ راست شناسا ہونے کا بھرپور موقع مِلا۔

حیدر آباد:۔

کہتے ہیں صدیاں پہلے ایک راجہ نیرون نامی نے اِس مقام پر ایک قلعہ تعمیر کیا جِسے ''نیرون کوٹ'' کہا جانے لگا۔ اٹھارویں صدی کے آخر میں جب دریائے سندھ نے اپنی راہ گذر بدلی تو سندھی حکمران اپنا قدیمی دارالحکومت خُدا آباد سے اُٹھا کر حیدر آباد لے آئے۔ اس بستی کے مضافات میں واقع خُشک پہاڑیوں کو سادھو اور درویش عبادت کے طور پر استعمال کرتے رہے۔ لیکن اب تو ''گنجوٹکنڑ'' کی جھاڑیاں تیتر اور دیگر چھوٹے پرندوں کا بسیرا بن چُکی تھیں۔ ہمارے دوست شیخ قمر جمیل شکار کے مَتوالے تھے اور اکثر اتوار کی تعطیل ہماری اُن کے ہمراہ اِس شُغل کی بھینٹ چڑھ جاتی تھی۔ ویسے بھی ہم جہاں بھی اپنی سرکاری مصروفیات کے سلسلے میں ساتھ جاتے قمر جمیل دو عدد شکاری بندوقیں ہماری گاڑی کی ڈِگی میں رکھ دیتے تھے۔ وادیٔ مہران کا سارا زیریں علاقہ گرمیوں کے موسم میں جَل تھَل ہو جاتا تھا اور سائبیریا سے آئے ہوئے بے شمار پرندے اِن جوہڑوں اور آبی ذخیروں کے گرد اُمڈ پڑتے تھے اور پھر ان کا شکار ایک دلچسپ مشغلہ بن کر ہماری سفری کوفتوں کا نعم البدل بن جاتا تھا۔

شہر کے قریب دریائے سندھ کے پُل پر جاتے تو وہاں پر تلی جانے والی مشہور پلّہ مچھلی کا لُطف ہی جُدا تھا۔ پُل کے پار ضلع دادو میں واقع سندھ کی مشہور علمی درسگاہ سندھ یونیورسٹی میں تو اکثر جانا ہوتا۔ یہاں ہمارے نہایت ہی مخلص اور عزیز دوست ڈاکٹر عرض محمد سُلنگی یونیورسٹی کے عملے اور طلباء کی خدمت کے لئے اپنا مطب چلا رہے تھے۔ ڈاکٹر صاحب سے ہماری پہلی ملاقات برادرم ڈاکٹر جہان حُسین کے توسط سے ایران میں ہوئی تھی۔ اُن کی بے پایاں محبت اور خلوص نے ہمیں ہمیشہ کے لئے گرویدہ بنالیا۔ اِسی یونیورسٹی کے شعبہ فائن آرٹس کے صدرِ شعبہ عبدالرحیم ناگوری ہمارے کیڈٹ کالج کوہاٹ کے دِنوں کے ساتھی تھے۔ ناگوری صاحب نہ صرف ایک نامور مُصّوِر، مجسمہ ساز اور فلسفہ ہائے مُصوری کے اُستاد تھے بلکہ ایک عظیم الشان دوست بھی تھے۔ سندھی ادب کے اُستاد خان محمد پنہور صاحب اور دیگر دوستوں سے اکثر محفلیں لگتیں تو وقت کی رفتار کا اندازہ بالکل بھول جاتا تھا۔ لیکن ہمارے انتہائی ماہر باورچی عاشق علی ہمیں ہمیشہ ڈراتے کہ جامشورو جہاں سندھ اور مہران یونیورسٹیاں واقع تھیں اپنے جلو میں انتہائی خوفناک لِسانیت پرست دہشت گرد سمائے ہوئے ہے جو غیر سندھیوں کی تکہ بوٹی کرنے پر ہر لمحہ تیار رہتے ہیں۔ خیر یہ تو اُن دِنوں کے سیاست دانوں کی نفرتیں پھیلانے کا ایک انداز تھا۔ لیکن ہم نے اپنے لئے محبت و خلوص کا قطعاً کوئی فُقدان نہ پایا۔ ویسے یہ دور ابھی ابتدا تھی پاکستان اور بالخصوص سندھ کی سیاست میں

ایک نئے عُنصر کے اُبھرنے کی۔لیکن ابھی تو ’’مہاجر قومی تحریک‘‘ کے مستقبل کے سحر بیان قائد الطاف حُسین کی مداح سرائی اِکا دُکّا دیوار پر لکھی ہوئی ہی نظر پڑتی تھی۔

ضلع دادو کا ذکر ہو اور وہاں عسا کرِ پاکستان کے لئے کام کرنے والی نرسری کیڈٹ کالج پٹارو کا ذکر نہ ہو یا پھر سہون شریف میں واقع عظیم صوفی بزرگ حضرت شہباز قلندر کو یاد نہ کیا جائے۔سندھی دستکاریوں کے مشہور مرکز اور مخدوموں کے شہر ہالہ اور پھر قریب ہی واقع سندھ کے لسان الغیب اور تصوف کے تاجدار حضرت شاہ عبدالطیف بھٹائی کے مرقد پر حاضری بھی ہر اُس مُسافر پر لازمی ہے جو سندھیوں کے دِل کی دھڑکنوں کو سمجھنا چاہتا ہو۔حیدر آباد سے کراچی آتے ہوئے قومی شاہراہ پر ٹھٹھہ کا تاریخی شہر مشہورِ زمانہ شاہجہانی مسجد کو اپنی آغوش میں لئے ہر راہ رو کو ماضی کے دریچوں میں جھانکنے کی دعوت دیتا ہے۔عرب سپہ سالار محمد بن قاسم کے اولین پڑاؤ ’’بندرگاہ دیبل‘‘ کا شہر بھنبور آپ کو عظیم رومانوی داستان سسّی پُنوں کی بھی یاد دِلاتا ہے۔ساتھ ہی ’’چوکنڈی‘‘ اور ’’ماکلی‘‘ کے جہان بھر میں شہرت یافتہ قبرستانوں کو بن دیکھے نہیں بنتی۔اِن سب بستیوں کا ہم نے چپّہ چپّہ چھان مارا تاکہ جو کچھ ماضی کے بزرگوں سے نظر انداز ہو گیا ہو وہ کمی اگر ہو سکے تو ہم پوری کر دیں۔

اِسی دور میں اپنے دیس کے مشہور صحرا تھر کی بھی خاک چھانی۔کہتے ہیں ضلع دادو کے شہر سہون شریف کے اطراف میں واقع ’’مانچھر جھیل‘‘ ایشیاء کی سب سے بڑی قدرتی جھیل ہے جو رقبے میں 24 مربع کلومیٹر ہے تو تھر پارکر ضلع میں واقع 28,170 کلومیٹر پر مُحیط ریگستان تھر ہے۔ہم نے اِس کے تقریباً سب ہی اہم قصبوں نوکوٹ، مِٹھی، نگر پارکر، چھاچرو، اسلام کوٹ اور عمر کوٹ کا دورہ کیا۔آخر الذکر میں مغل شہنشاہ ہمایوں کی افغان جرنیل شیر شاہ سوری کے ہاتھوں شکست اور اپنے سگے بھائیوں کے ہاتھوں برادرانِ یوسف والا سلوک سب ہی کچھ ہماری نظروں کے سامنے سے گزرا۔آخر عمر کوٹ کو ہی تو مشہور مُغل تاجدار اکبرِ اعظم کی جائے پیدائش ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔حیدر آباد سے یہاں تک تو دریائے سندھ کے پانیوں سے سیراب ہونے والے سرسبز و شاداب کھیتوں کا جال بچھا ہوا ہے جہاں کے آم اور کیلے نہ صرف پاکستان بھر کے ہر شہر میں جاتے ہیں بلکہ بیرونِ مُلک بھی برآمد ہوتے ہیں۔لیکن عمر کوٹ سے آگے پھر اچانک لق و دق صحرا شروع ہو جاتا ہے۔سب سے خوبصورت پرندے ’’مور‘‘ کا مسکن یہی صحرا ہے۔اس ریگستان کا جنوبی علاقہ البتہ ساحلِ سمندر پر واقع ہونے کی وجہ سے مختلف النوع نباتات وحیوانات کو اپنی آغوش میں لئے ہوئے ہے۔چونکہ یہ سارا علاقہ دریائے

سندھ کے طاس کا زیریں حصہ گردانا جاتا ہے لہذا ہر جگہ سیم وتھور کی وجہ سے آبادیاں شکست وریخت کا شکار نظر آئیں۔ مگر پوسٹ آفس کی عمارات جہاں بھی دیکھیں مقابلتاً بہتر حالت میں نظر آئیں۔ شاید اِس کی وجہ بنانے والوں کی خلوصِ نیت کے ساتھ ساتھ محکمہ ڈاک کے باقاعدہ معائنوں کے نِظام میں پنہاں تھی۔

بالائی سندھ میں ہم نے سکھر اور روہڑی کے جڑواں شہروں کو نظر بھر کر دیکھا جو ماضی کے تاریخی شہر ''ارور'' کے مضافات میں پروان چڑھے اور دریائے سندھ کے دونوں جانب آباد ہیں۔ یہاں پر دریا کا پُل انجینئرنگ کا شاہکار تصور کیا جاتا ہے۔ ہماری ہر دم بدلتی تاریخ کے ساتھ ساتھ اِسکا نام بھی وقتاً فوقتاً بدلتا رہا ہے۔ یہاں قریب ہی میں سابقہ ریاست خیر پور کا صدر مقام اپنی شاہانہ آن بان کے ساتھ ساتھ اچھی کھجوروں کی افزائش اور برآمد کے لئے بھی مشہور ہے۔ خیر پور سے ''پیر جو گوٹھ'' جاتے ہوئے سڑک کے ساتھ ساتھ بہنے والی نہر کو ہم نے غیر معمولی انداز میں لبالب پایا۔ جبکہ زیریں سندھ میں پانی کی کمی کی شکایت عام تھی۔ کیا کاشتکار اور کیا ماحولیات کی فکر کرنے والے۔ سب نامناسب تقسیمِ آب کے شاکی تھے۔ بہرحال سندھ کی سیاست میں پانی کی کمی بیشی کا سماں ایک اہم عُنصر سمجھا جاتا ہے۔

نیپا کراچی:۔

ابھی ہم اپنے سرکل کے طول وعرض میں گھوم پھر کر زمینی صورتِ حال کا جائزہ لینے اور مزید بہتری کے لئے منصوبہ بندی کے عمل سے گذر رہے تھے کہ اچانک ہمیں قومی ادارۂ عوامی نظم ونسق (NIPA) میں چار ماہ کے کورس میں شرکت کے لئے کراچی جانے کا حُکم مِلا۔ یہ تربیت تمام سویلین ملازمینِ سرکار کے اعلیٰ درجے میں تعیناتی کے لئے ضروری تصور کی جاتی ہے۔

نیپا کراچی میں ہماری ملاقات چند ایسے افراد سے رہی جنہوں نے قومی زندگی کے مختلف پہلوؤں میں نمایاں کردار ادا کیا۔ ہمارے ڈائریکٹر افتخار احمد مدنی تحریکِ پاکستان کے صفِ اول کے رہنما نوب اسماعیل خان کے صاحبزادے ہونے کے علاوہ اپنی ذات میں بھی ایک انجمن تھے۔ اُن کا علم وادب سے گہرا لگاؤ اور فنونِ لطیفہ سے تعلق ہمارے اور مُلک کے مایہ ناز ادباء وشعراء، علماء اور ماہرینِ فن کے درمیان فاصلوں کو کم کرنے میں کافی مُمد و معاون ثابت ہوا۔ مُلک کے نامور مُصور جناب صادقین اُن دِنوں ہمارے اس ادارے سے یوں مُنسلک تھے کہ مدنی صاحب نے اُن کی بے پناہ صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے اُنہیں ''نیپا'' کے نئے آڈیٹوریم کو اپنے مخصوص

انداز سے قرآنی آیات سے مزیّن کرنے کا کام سونپ رکھا تھا۔ ''نیپا'' کے ایک اور مستقل مہمان شمالی یورپ کے مُلک ناروے سے تعلق رکھتے تھے جو کئی مشرقی زبانوں سے شناسا تھے۔ اوسلو یونیورسٹی سے بطورِ اُستاد وابستہ تھے۔ اور اب وہ اپنی اُردو کی نوک پلک درست فرما رہے تھے۔ کراچی میں موجود معروف اساتذہ کرام سے اُن کا مُستقل رابطہ رہتا تھا جن میں سے کسی حضرت نے اُنہیں یہ قیمتی مشورہ دیا تھا کہ اُردو کی روزمرہ کی گہرائیوں میں اُترنے کے لئے وہ اِس زبان میں لکھی گئی بے شمار جاسوسی کہانیوں کی ورق گردانی فرمائیں۔ وہ اس مشورہ پر صدقِ دِل سے عمل پیرا تھے اور پھر ہم خادمین سے نت نئے دریافت کردہ الفاظ اور محاوروں کے بخیئے اُدھیڑنے میں مصروف رہتے۔ ہمارے ہم درس محترم مُرتضیٰ موسوی صاحب سے جو اُن دِنوں اسلام آباد کے پاکستان نیشنل سینٹر کے ڈائریکٹر جنرل تھے، اُن کی خاص دوستی تھی اور اُن کی شیریں اُردو اور فارسی گفتگو سے اِن دونوں زبانوں کی اصل چاشنی سے محظوظ ہوتے رہتے تھے۔ موسوی صاحب بھی اُردو کے اِس فرنگی مجنوں کو ملتے تو لامحالہ یہ شعر ارشاد فرماتے۔

قیس جنگل میں اکیلا ہے، مجھے جانے دو
خوب گزرے گی جو مِل بیٹھیں گے دیوانے دو

اِس اِدارے میں معمول کی کاروائی کے مطابق ورکشاپس، سیمینار اور مختلف شعبہ ہائے زندگی سے وابستہ ماہرین کی تقاریر سے ہم سب شُرکا مستفید ہوتے رہے۔ اِن میں اس عروس البلاد کی تہذیبی اور ثقافتی سرگرمیوں کے اُس دور کے رُوحِ رواں خواتین وحضرات سے ہماری ملاقاتیں ہوتی رہیں اِن میں جامعہ کراچی کے وائس چانسلر پروفیسر کرّار حُسین اَدبی اور مذہبی سکالر حَسن مُثنّیٰ ندوی، تحریکِ پاکستان سے وابستہ سپاہی اور کراچی کے اولین کمشنر سید ہاشم رضا، کراچی ہی کے ایک اور کمشنر پرویز بٹ اور بے شمار دوسرے زُعما اور عُلماء نے ہمارے ذہن کی آبیاری میں اپنا رول ادا کیا۔ اُس وقت کے وفاقی سیکرٹری ایسٹبلشمنٹ اور نامور ماہرِ اقتصادیات آفتاب احمد خان صاحب تو بڑے ذوق وشوق سے ہمارے ہاں تشریف لاتے اور ہم نہ صرف اقتصادی اور انتظامی امور کے متعلق اُن کے زریں خیالات سے مُستفید ہوتے بلکہ اُن کی غالب فہمی کی داد دیئے بغیر نہ رہ پاتے۔ خود ہمارے اِدارے کے ڈپٹی ڈائریکٹر اور نوجوان ماہرِ اقتصادیات وانتظامی امور ڈاکٹر انوار حسین صدیقی بھی ماحول کو علمی اور ناقدانہ پہلو فراہم کرنے میں کسی سے پیچھے نہیں تھے۔ یہیں پر ہم نے فیض احمد فیض صاحب کی اولین برسی منائی اور اُن کی نامور رفیقِ حیات محترمہ ایلس فیض اور دیگر بے شمار پرستارانِ فیض کے اِرشادات ونگارشات سے فیض یاب ہوئے۔

صوبائی دارالحکومتوں کے دورے:۔

نیپا کراچی میں قیام کے دوران پاکستان کے چاروں صوبوں میں ہونے والے ترقیاتی عمل اور منصوبوں سے واقفیت حاصل کرنے کی خاطر ہمیں مختلف صوبائی صدر مقامات پر جانا پڑا۔ جہاں نہ صرف وہاں کے ذمہ داران سے مفید معلومات حاصل ہوئیں بلکہ بچشمِ خود ترقیاتی کاموں کی منزل اور رفتار و پیشرفت کو ملاحظہ کیا۔ ڈاکٹر انوار صدیقی صاحب نے اپنے سابقہ تجربے کی بنیاد پر ہمیں پیشگی آگاہ کر دیا کہ ہمارے اِس مختصر گروپ جس میں پاکستان کے مختلف وفاقی محکموں اور اِداروں سے وابستہ افسران شامل تھے، کی بہترین سواگت اور رہنمائی صوبہ سرحد اور بلوچستان میں ہوگی جبکہ بڑے دو صوبوں پنجاب اور سندھ میں اسی ترتیب سے سرد مُہری کی توقع رکھنی چاہیے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ صوبہ سرحد کے صدر مقام پشاور میں صوبائی سیکریٹریٹ میں اُس صوبے کے جاندار اور ہر دلعزیز چیف سیکرٹری صاحبزادہ امتیاز صاحب نے خوش آمدید کہا اور شمال مغربی صوبے اور ملحقہ قبائلی علاقے کے متعلق ہماری معلومات میں قابلِ قدر اضافہ فرمایا۔ جبکہ بلوچستان کے شہر کوئٹہ میں وہاں کے چیف سیکرٹری نے ہمیں اُس بہ لحاظِ رقبہ سب سے بڑے صوبے کے ''اے ایریاز'' اور ''بی ایریاز'' کے درمیان انتظامات کے فرق سے آگاہ کیا۔ معلوم ہوا کہ اُن دِنوں تک سوائے کوئٹہ اور خاران کے اضلاع کے باقی نوّے فیصد علاقہ ''بی ایریا'' شمار ہوتا تھا۔ جہاں صوبائی حکومت کا عمل درآمد نہ ہونے کے برابر تھا اور جہاں روایتی سرداری نظام کا دور دورہ تھا۔ صوبہ سندھ کی سیکرٹیریٹ میں تو ایک ایڈیشنل سیکرٹری سے ہماری ملاقات ہوسکی مگر پنجاب سیکرٹیریٹ میں تو ہمیں محض ایک ڈپٹی سیکرٹری سے ہی ملاقات کا موقع مِل سکا۔ یہاں تعلیم و تربیت کو حکومتی ترجیحات میں اتنی ہی اہمیت دی جاسکتی تھی۔

بھارت اور سنگاپور کا دورہ:۔

بھارت اور سنگاپور میں کیا مماثلت ہوسکتی ہے؟ لیکن ایک بہت بڑے مُلک اور ایک بہت ہی چھوٹے مُلک کے انتظامی ڈھانچے کا تقابلی جائزہ مقصود تھا لہٰذا ہم نو عدد شرکائے کورس کو بیرونِ مُلک اِن دو دیسوں میں بھیجا گیا تاکہ وہاں سے کچھ نئے اور بہتر تصورات اپنے پیارے دیس کے مقدر کو بیدار کرنے کی خاطر درآمد کر سکیں۔ ہمارے رفقاء میں سے ایک یعنی وِنگ کمانڈر جعفری کا تعلق چونکہ افواجِ پاکستان سے تھا جو ہمارے ساتھ

انڈیا نہ جا سکے، باقی سب یعنی راقم الحروف (پاکستان پوسٹل سروسز)، مرتضیٰ موسوی (وزارتِ اطلاعات و نشریات)، محسن خان (آڈٹ اینڈ اکاؤنٹس)، عطاءاللہ (پاکستان کسٹمز)، آئی اے صدیقی (پاکستان ریلویز اور پاکستان سٹیل مِلز)، تالپور (حکومتِ سندھ)، مسٹر اُنڑ (ایگریکلچر ریسرچ کونسل) اور مسٹر عباسی (وزارتِ صنعت و حرفت)۔ اِس دورے میں ڈاکٹر انوار صدیقی کی سرکردگی میں پہلے کراچی سے دہلی پھر آگرہ، ہردوار، ڈیرہ دون، ڈلہوزی اور پھر میسور، سُرنگا پٹم اور بمبئی گئے۔

نئی دہلی کے ہوائی مستقر پر اُترے تو آگے سے ہمارے بھارتی میزبان ہماری ضرورت سے کچھ زیادہ بڑی ایک بے ہنگم سی بس ساتھ لئے مُنتظر دِکھائی دیئے۔ یہ ٹاٹا کی بسیں بھارت کی ہر سڑک پر دوڑتی نظر آتی ہیں۔ اتنے بڑے مُلک میں چھوٹی سواریاں کچھ نایاب نظر آئیں۔ ہمارے لئے جس ہوٹل میں بکنگ کی گئی تھی، وہ ہمارے ساتھیوں کو مرکزِ شہر سے کچھ زیادہ دور معلوم ہوا۔ لہٰذا ''کوناٹ پیلس میں ایک'' ہوٹل میں قیام ہوا۔ اگلی صبح وہی بس ہمیں پُرانی دہلی میں واقع تاریخی عمارات کی سیر کرانے کے لئے آئی۔ جمعہ کا دن تھا لہٰذا سب دوستوں نے یہاں کی مشہور شاہجہانی مسجد میں جمعہ پڑھنے اور پھر قریب ہی واقع ایک ریستوران میں دوپہر کا کھانا کھانے کا اِرادہ کیا۔ مسجد کا نام سُنتے ہی بس ڈرائیور پریشان ہو گیا۔ اُدھر سولھویں صدی کی تاریخی بابری مسجد کے انہدام کی باتیں ہو رہی تھیں اور جامع مسجد دہلی کے امام صاحب اِسی دِلخراش واقعے کے سلسلے میں حاضرین کے جذبات پر گویا تیل چھڑک رہے تھے۔ لہٰذا ڈرائیور نے مسجد سے کچھ دور ایک گلی میں بس کھڑی کی اور ہم پیدل ہی مسجد کی طرف گامزن ہوئے۔ نماز کے بعد قریبی ریستوران میں دہلی کے نامی گرامی دسترخوان سے محظوظ ہوئے۔ بس کی تلاش میں نکلے تو بس ڈرائیور مارے خوف کے وہاں سے بغیر اپنا کرایہ وصول کئے رَفو چکر ہو چُکا تھا۔

خیر اپنے میزبان بھارتی افسر کے مشورے سے ٹیکسی کاروں کے ذریعے سفارتِ پاکستان پہنچے جہاں پاکستانی سفیر ڈاکٹر ہمایوں خان صاحب ہمارا انتظار فرما رہے تھے۔ پاکستانی سفارت خانے کی عظیم الشان عمارت کے کمیٹی روم میں اُنہوں نے فرداً فرداً تعارف کے بعد ایک مختصر سی بریفنگ دِی اور میزبان افسر کی موجودگی میں بھارتی سرکار کا ہمارے لئے سہولیات فراہم کرنے پر شکریہ ادا کیا۔ اور پھر ہمیں رُخصت کرنے کے لئے عمارت سے باہر نکلے۔ دیکھا تو ہماری سواری ندارد۔ اُنہیں بھارتی سرکار کی جانب سے بس کی فراہمی اور اُس کے ڈرائیور کی فرار کی داستان مجبوراً سُنانی پڑی۔ اُن کے ماتھے پر پُرسکون شکنیں اُنکی بے

قراری کی غمازی کر رہی تھیں لیکن بھارت میں مقیم پاکستانی سفیر کے لئے اِس قِسم کی ٹینشن معمول کی بات تھی۔ اُنہوں نے فوراً ہی اپنی سفارت کی گاڑیوں کو ہمیں ہماری اگلی منزل پر پُہنچانے کے لئے کہہ دیا۔ اُس لمحے اُن کی ذہنی کیفیت کو کچھ یوں بیان کیا جا سکتا تھا۔

ہماری جان پر دُہرا عذاب ہے محسن
کہ دیکھنا ہی نہیں، ہم کو سوچنا بھی ہے

دہلی کی سیر اِسرانی جی کے ساتھ:۔

سفارت خانے سے ہی ہم نے اپنے دیرینہ ساتھی اِسرانی جی کو فون کیا جو اُس وقت دہلی ہی میں ڈاک و تار کے صدر دفتر میں بیمہ زندگی کے ڈائریکٹر کے طور پر مُتعین تھے۔ اُنہوں نے اپنے ہاں پٹیل روڈ (پٹیل مارگ) پر واقع ڈاک تار بھَون آنے کو کہا۔ لہٰذا سفارت خانے سے نکل کر ہم اُس طرف چل دیۓ۔ بدقسمتی سے رِکشہ ڈرائیور سردار جی ہمیں اُس علاقے میں واقع ایک ڈاک گھر میں لے گئے۔ بہر حال ڈاک خانے کے پوسٹماسٹر بھی ایک سردار تھے۔ اُنہوں نے مہربانی فرماتے ہوئے اپنا ایک ہرکارہ ہمارے ساتھ ڈاک تار بھَون روانہ کیا۔ جو ایک بلند و بالا کئی منزلہ عمارت تھی۔ بھارت کے دوسرے سرکاری دفاتر کی طرح یہاں بھی اِستقبالیہ وزارتِ داخلی امور کے کارپردازوں سے آباد تھا۔ اُنہوں نے ہمارا مختصر سا انٹرویو لینے کے بعد اِسرانی جی کے پاس آٹھویں منزل پر بھجوا دیا۔ ہماری حسبِ توقع اِسرانی جی ہم سے مِل کر بہت خوش ہوئے اور فوراً اپنے گھر اِطلاع کر دی۔ ساتھ ہی فرمانے لگے کہ اُن کے بچوں کی خواہش ہے کہ وہ ہمیں کہیں جانے نہ دیں اور شام کو اپنے ساتھ گھر لیتے آئیں۔ ہم نے ہزار بہانے کئے کہ بھئی ہمارا قیام یہاں صرف ایک روز ہے اور ہم دہلی میں بہت کچھ دیکھنا چاہتے ہیں۔ فرمانے لگے "یہ تمہاری پریشانی نہیں ہونی چاہئے۔ لو پہلے لنچ کھا لیتے ہیں"۔ معلوم ہوا اِسرانی جی روز اپنا لنچ ساتھ لے کر آتے ہیں اور آج اِس میں ہم بھی اُن کا ساتھ دیں گے۔

چُھٹی کے وقت باہر سڑک پر نکلے تو میں پٹیل مارگ کی مصروف شاہراہ سے ڈاک تار بھَون کی عمارت کو دیکھنے لگا۔ اِسرانی جی پوچھنے لگے "کیا سوچ رہے ہو"؟۔ "یہی کہ اگر پاکستان نہ بنتا تو میرا تو صوبہ سرحد کے ایک دورافتادہ گاؤں سے یہاں تلاشِ روزگار میں پہنچنا بہت ہی مشکل تھا"۔ کہنے لگا۔ "پاکستان نہ بنتا تو صوبہ سندھ کے میر پور خاص سے میرا بھی یہاں آنا شاید ناممکن ہوتا"۔ واضح رہے کہ اِسرانی کا خاندان تقسیمِ برصغیر کے وقت

شرنارتھی کی حیثیت سے راجپوتانہ چلا گیا تھا۔

تھوڑی دیر میں ہم ایک ''ڈی لوکس'' بس میں بیٹھے دہلی کی سڑکیں ناپتے ہوئے اِس تاریخی شہر کی گھما گھمی میں کھو چُکے تھے۔معلوم ہوا شہر میں دو قسم کی بس سروس چلتی ہے۔ایک ڈی لوکس جو آرام دِہ ہونے کے علاوہ لمبے روٹس پر صرف ایک آدھ سٹاپ پر رُکتی ہے۔جبکہ دوسری قسم کی بسیں ہر پڑاؤ پر مسافروں کو اُتارتی چڑھاتی رہتی ہیں۔پوسٹل کالونی میں واقع اِسرانی جی کے فلیٹ کی نچلی منزل پر پورچ میں ایک گاڑی پر خاکی چادر پڑی ہوئی تھی۔ہم نے پوچھا''یہ کس کی کار ہے؟''فرمانے لگے''تمہارے بھائی کی اور کِس کی؟''۔ ''تو پھر ہمیں بس کے سفر میں خوار کرنا ضروری تھا؟''۔ہم نے سوال کیا۔کہنے لگا''روز اپنی کار میں کون پٹرول استعمال کرتا ہے''۔''تو پھر اس بیکار چیز سے کیا کام لیتے ہو؟''۔ہم نے اُسے چھیڑا۔کہنے لگا۔''اِس میں شام کو تمہیں دہلی بھر میں گھمائیں گے''۔اور ایسا ہی ہوا۔

اُس کے گھر میں داخل ہوئے تو ڈرائنگ روم میں تمام فرنیچر ڈھکا ہوا تھا۔بھابی نے نمسکار کہتے ہوئے ایک دو صوفوں سے چادر اُٹھالی اور پھر سندھی زبان میں ہماری خیریت پوچھنے لگی۔اِسرانی نے بتایا کہ یہ تو پشتو بولتا ہے۔''ٹھیک ہے مگر میں سندھی سمجھ لیتا ہوں۔آخر اِس وقت میری پوسٹنگ حیدرآباد سندھ میں ہے''۔ہم نے گِرہ لگائی۔

کھانے کی میز پر بیٹھے تو بھینی بھینی مہک کے ساتھ بے شمار پکوان دسترخوان کی زینت بنے ہوئے تھے۔ کئی اقسام کے گوشت پر مشتمل ڈِشیں بھی حاضر تھیں۔ہم نے اُنہیں ہاتھ لگانے میں تامُل کیا۔تو اِسرانی جی سمجھ گئے۔کہنے لگے۔''بھئی یہ سب حلال گوشت ہے۔ہمارے ہاں ہندو قصاب شاذونادر ہی ہوگا۔وہ بڑے گوشت کو ہاتھ ہی کیسے لگائے گا'' ہم نے جتنا کھانا تھا وہ کھایا۔لیکن میزبان دسترخوان کو ہاتھ نہیں لگا رہے تھے۔آخر اِسرانی نے راز بتا دیا۔کہنے لگا۔''آج منگل وار ہے اور اِس روز تمہیں معلوم ہے ہم کوئی پکی ہوئی چیز نہیں کھاتے''۔

گرمی کی تمازت میں قدرے کمی آئی تو ہمارے میزبان ہمیں پہلے تو ہندوستان کے اولین مسلمان تاجدار قطب الدین ایبک کے نام سے موسوم قُطب مینار دِکھانے لے گئے۔اور پھر شام کو پُرانی دہلی میں واقع مُغلوں کی تعمیر کردہ شاہی مسجد اور لال قلعہ۔وہاں واقع مسجدِ قوت الاسلام تو خاندانِ غلامان کے اولین تاجدار کے حکم سے تعمیر ہوئی ہوگی۔مگر یہ قطب صاحب کی لاٹھ؟اِس کے متعلق تاریخی حقائق ہماری پڑھی ہوئی کتابوں اور اِسرانی جی کے زیرِ مطالعہ تاریخ کی کتابوں میں مختلف تھیں۔ایک کا ہیرو دوسرے کے لئے وِلن تھا۔ایسے ہی اختلافات کی وجہ سے

تو برصغیر ہندوستان کی تقسیم ہوئی۔ دہلی کی عظیم الشان شاہی مسجد کے عظیم الجثہ دروازے کی موجودہ حالتِ زار دیکھ کر افسوس کیا جا سکتا تھا۔ مسجد کی راہداریوں میں ہر کوئی ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی جوتوں سمیت گھوم رہا تھا مگر ہر کوئی عمارت کی شان و دبدبے سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکتا تھا۔ ''تم یہاں نماز پڑھ لو۔ میں نیچے اُتر کر سامنے خوبصورت تعمیر شدہ رام مندر میں پرارتھنا کر لیتا ہوں''۔ اسرانی جی بولے۔ ''نہیں بھئی عصر اور مغرب کے درمیان کوئی نماز نہیں ہوتی۔ ہاں البتہ ہم مسجد کی سیڑھیوں سے اُتر کر اُس مردِ قلندر سرمد کے مرقد پر دُعا کے لئے ہاتھ اُٹھا لیتے ہیں۔ جس کی آزاد منش سوچ شہنشاہ اورنگزیب عالمگیر کے درباری عُلماء و فُقہا کے بُنیاد پرست اذہان سے متصادم ہوئی تو اُس نے تختہ دار پر لٹک کر عاشقانِ پاک طنیت کی ایک نئی تاریخ مُرتب کر دی۔

شام ہونے لگی تو اِسرانی نے بتایا کہ شاہی قلعے میں رنگ و آہنگ کے پردے میں لال قلعے کی تاریخ پیش کی جاتی ہے۔ لہٰذا دریائے جمنا کے کنارے آباد اِسی تاریخی قلعے میں ہم نے مُغل دور کے بادشاہوں، شاہزادوں، شاہزادیوں، محل سراؤں اور کنیزوں کی اِس تاریخی عمارت میں شام و سحر کی داستانیں سُنیں۔ اِتفاق سے رات کا اندھیرا جوں جوں بڑھتا جا رہا تھا توں توں موسم خوش گوار ہوتا جا رہا تھا۔ بہر حال چوبداروں کی بارُعب آوازیں گھڑی گھڑی ''باملاحظہ۔ باادب، ہوشیار'' کی صدائیں پُکار رہیں تھیں اور ساتھ ہی مترنم نسوانی آوازیں موسیقی کی دُھنوں میں ڈھلتی جا رہی تھیں۔ یوں شاہی قلعے کا سارا ماحول بہ زبانِ حال پُکار رہا تھا کہ۔

ماضی میں جو مزا میری شام و سحر میں تھا
اب وہ مزا تصورِ شام و سحر میں ہے

اگلی صبح سرکارِ انگریزی کے بنائے ہوئے دِہلی گیٹ سے ہوتے ہوئے اپنی پوری شاہانہ طمطراق سے ایستادہ بھارت سرکار کی راجدھانی کی بلند و بالا سُرخ اینٹوں کی بنی گنبدوں اور وسیع و عریض راہداریوں کو دیکھتے ہوئے مختلف وزارتوں کے کمیٹی رومز میں گئے جہاں ہمیں سرکاری اعلیٰ عہدے داروں کی جانب سے بریفنگ دی گئی اور ہمارے سوالات کے جوابات دئے گئے۔ مختلف سیاسی اور انتظامی شخصیات سے مُلاقاتیں ہوئیں اور بھارت کی مرکزی سرکار کی سوچ اور منصوبوں کے بارے میں آگاہی ہوئی۔

آگرہ کا سفر:

مُغل حکمرانوں کے سُنہری دور کی عظیم اور شہرہ آفاق یادگار ''تاج محل'' کو دیکھنے آگرہ گئے۔ جہاں ہم

سب کے اذہان میں ساحرلُدھیانوی کا یہ مصرعہ برابر گھومتا رہا۔

ایک شہنشاہ نے دولت کا سہارا لے کر
ہم غریبوں کی محبت کا اُڑایا ہے مذاق

لیکن کسی لُٹے پٹے شاعر کی ایسی ویسی سوچ بہر حال تاج محل کی عظمت و رفعت کو کیا کم کرے گی۔ تاج محل واقعی دیکھنے کی چیز ہے لیکن آج اُس کی بربادی کے سامان اُس دیس کی صنعتی ترقی کے ہاتھوں بنتے جارہے ہیں۔ ماحولیاتی آلودگی تاج محل کے خوبصورت اور دِل کش سنگِ مرمر کی اولین دُشمن ہے۔ اِس شہر کے کاریگر آج بھی ہر کسی کے ذوق وشوق کے معیار پر پورا اُترتے ہیں۔ تاریخی تاج محل کے سائے میں واقع کئی دُکانیں اِن عجوبہ روزگار ہاتھوں کے بنائے ہوئے سنگ تراشی اور دیگر صنائع کے دِلکش نمونوں کی خوب نمائش کرتی ہیں۔ ہم سب دوستوں نے اِن کاریگروں کی اچھی سر پرستی کی۔ البتہ ہمارے ساتھ وابستہ مسلمان گائیڈ نے یہاں کی اقلیت میں آباد باسیوں کی حالتِ زار کا جو نقشہ کھینچا۔ اُس کا صحیح اندازہ ہمیں اگلے چند روز کے قیام میں خوب ہوا۔

ہمارے ایک ساتھی صدیقی صاحب کا خاندان ضلع مظفر نگر سے تعلق رکھتا تھا۔ لہٰذا مظفر نگر شہر سے گزرتے ہوئے انہوں نے اِس شہر کے گلی محلوں میں بچپن کے ایام کی یادیں دہرائیں۔ اتفاق سے اِس سفر میں اِسی ضلع میں برلبِ سڑک واقع ایک آرام گاہ پر دوسرے مسافروں کی طرح ہم لوگ بھی رُکے۔ ہم سب نے تھوڑی دیر ستانے کے بہانے چائے کا آرڈر دیا۔ ہمارے دوست محسن خان ساتھ واقع چمنستان میں نماز پڑھنے کے لئے کھڑے ہوئے اور اُدھر ریستوران کے خادمین بڑے بڑے خوان اُٹھائے حاضِر ہو گئے جِن پر قِسم قِسم کی اشیائے خورد ونوش سجائی گئی تھیں۔ ہمارے گروپ لیڈر موسوی صاحب نے اُنہیں ڈانٹتے ہوئے انداز میں پوچھا۔ ''اس کا تمھیں کس نے کہا؟ ہم نے تو محض چائے کی فرمائش کی تھی''۔ خادمین بولے ''جناب مالک کا حکم تھا'' ''کون ہے تمہارا مالک؟ اُسے بلاؤ''۔ موسوی صاحب گرجے۔ مالک حاضر ہوا تو معلوم ہوا وہ مسلمان ہے اور اُس نے محض محسن خان کو چمن میں نماز پڑھتے دیکھ کر اندازہ لگا لیا کہ ہم لوگ پاکستان سے آئے ہیں اور وہ اب ہماری میز بانی میں کوئی کسر چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ بہر حال اُس کی زبانی معلوم ہوا کہ وہ ایک ریٹائرڈ سِول سرونٹ کا بیٹا ہے۔ جس نے اپنی حاصل کردہ پنشن کی رقم سے اپنے بیٹے کے لئے یہ کاروبار شروع کر دیا تھا۔ اُس نے بتایا کہ اُس کے ضلعی صدر مقام پر واقع خواتین کے کالج میں کوئی دو ہزار لڑکیاں زیرِ تعلیم ہیں۔

جن میں محض اُن کی ایک بہن مُسلم اقلیت سے تعلق رکھتی ہے۔ باقی عام طور پر مسلم خواتین سیاہ برقعوں میں ملبوس کہیں کہیں نظر آ جاتی ہیں۔ لیکن ابھی اعلیٰ تعلیم میں اُن کا حصہ نہ ہونے کے برابر ہے۔

ڈیرہ ڈون اور ڈلہوزی:

ہمالیہ کے دامن میں واقع ہندوستان کی مشہورِ زمانہ فوجی افسران کی تربیت گاہ کے شہر ڈیرہ ڈون سے گزر ہوا۔ مقابلتاً خوشگوار موسموں والا یہ شہر کئی دیگر شہرہ آفاق تعلیمی اور فنی اداروں کا مرکز بھی ہے۔ آگے جا کر پہاڑوں کی چوٹی پر میدانوں کی سخت گرمی سے پناہ لینے کے لئے ڈلہوزی کی تفریح گاہ واقع ہے۔ یہیں پر بھارت کی اعلیٰ نوکر شاہی کے نئے اہلکاروں کے لئے تربیت گاہ قائم کی گئی ہے۔ اِس جگہ کی نسبتاً محدود گنجائش کے باعث صرف مَعدُودے چند افسران کو یہاں آنے کا موقع مِلتا ہے۔ چنانچہ ہمیں بتایا گیا کہ اُس سال بھی مقابلے کے امتحان میں چار ہزار منتخب شدہ افسران میں سے مختلف شعبہ جات کے محض چار سو چودہ مرد وزن افسران کو یہ سعادت مِل سکی تھی۔ ان میں صرف چھ عدد زیرِ تربیت افسران کا تعلق پوسٹل سروسز سے تھا۔ اِتفاق سے تدریسی عملے کے واحد مسلمان افسر جو بلند شہر کے ایک خان صاحب تھے کا تعلق بھی ہمارے گروہِ نامہ بران سے تھا۔ لہٰذا اُن سے ہماری خوب دوستی رہی۔ ویسے تمام شعبہ ہائے زندگی سے متعلق افراد ہم سے پاکستان کے متعلق زیادہ سے زیادہ جاننے میں خاصی دلچسپی لیتے نظر آئے۔ معلوم ہوا ہمارے وہاں آنے سے پہلے بھارت کی سب سے مضبوط ترین اعصاب کی مالکہ پَردھان منتری اِندرا گاندھی اِس اِکادمی میں تشریف لائی تھیں۔ زیرِ تربیت افسران نے جب اُن سے عصری تقاضوں کے مطابق اُن کی تربیت سے گھڑ سواری کو خارج کرنے کی استدعا کی تو محترمہ نے انتہائی دُرشت لہجے میں جواب دیا۔ ''جو شخص ایک عدد گھوڑے کو نہیں سنبھال سکتا وہ ایک پورے ضلع کو کیسے سنبھال سکے گا''۔ ہمیں یہ بھی بتایا گیا کہ ہر نئے افسر کی پہلی تعیناتی لازماً اپنے صوبے سے بہت دور کسی دوسری ریاست میں ہوتی ہے۔ یعنی ہریانہ سے تعلق رکھنے والے کو بنگال میں اور پنجابی یا بہاری افسر کو کِرالہ یا تامل ناڈو میں مُتعین کیا جاتا ہے۔ افسوس کہ پاکستان میں اِس روایت پر اب عمل درآمد کم ہوتا جا رہا ہے۔

''ہردووار'' اور ''کلیر شریف'':

ڈلہوزی سے واپسی پر ڈاکٹر صدیقی کے مشورے سے ہم مُقدس دریائے گنگا پر واقع ''ہردوار'' گئے۔ جہاں

سال بھر دُنیا بھر کے ہندو یاتری اِس دریا کے مقدس پانی سے اَشنان کی سعادت حاصل کرتے ہیں۔ اِس مقام پر یہ مُہیب دریا خوب پھیلا ہوا ہے اور یاتریوں کی سہولت کے لئے دریا کے اندر ہی کئی پلیٹ فارم بنائے گئے ہیں۔ ہمارے ڈرائیور بابورام نے گاڑی کھڑی کرتے ہوئے کہا۔ ’’آپ لوگ جلدی سے اَشنان کر آیئے میں اپنی گاڑی دھو لیتا ہوں‘‘۔ ہم نے ہزاروں بوڑھے، جوان، مردوں، عورتوں کو دیکھا جن میں سے ہر ایک چھوٹا سا لوٹا لئے اپنے جسم کے کسی نہ کسی حصے پر چلّو بھر پانی ڈال رہا تھا جیسے دِل کھول کر اپنے ’’شریر‘‘ پر پانی بہانے سے اس عظیم دریا کے پانی میں کمی واقع ہو جائے گی۔ ہم لوگ واپس آئے تو بابورام ابھی اپنے کام میں مصروف تھا۔ پوچھنے لگا۔ ’’آپ لوگ بغیر اَشنان کئے جائیں گے؟ شاید یہ موقع پھر کبھی نہ مِلے‘‘۔ اُدھر سب ڈرائیوروں کو دہلی جانے سے پہلے **کلیر شریف** جانے کو کہا گیا جو راستے ہی میں پڑتا ہے۔ ’’وہاں تو ہندوستان کا بے تاج بادشاہ خواجہ غریب نواز ہے‘‘۔ بابورام بولا۔ اور واقعی ایسا ہی ہم نے دیکھا۔ مزار پر آنے والے سب زائرین ہندو، سکھ، مسلمان خواجہ کے مرقد کی طرف پیٹھ موڑے بغیر اُلٹے پاؤں مزار کے احاطے سے نکل رہے تھے۔ ’’ارے یہ راج تو صدیوں بعد بھی قائم ہے‘‘۔ ہم نے دِل میں کہا۔

فتح پور سیکری:

اِسی دورے میں ہم نے مغلِ اعظم جلال الدین اکبر کے دَور میں نئے تعمیر کردہ دارالخلافہ کی عمارات بھی **فتح پور سیکری** کے مقام پر دیکھیں جو صدیوں سے اب تک اچھی بھلی حالت میں موجود بزبانِ حال اپنے استعمال میں نہ لائے جانے کا دُکھڑا سُنا رہی ہیں۔ بادشاہوں کے ہر کام کرنے کی اپنی منطق ہوتی ہے اور اِسی لئے کہا جاتا ہے۔ ’’رموزِ مملکت خویش خسرواں دانند‘‘۔ یہیں پر مُغلِ اعظم کے روحانی شیخ حضرت سلیم چشتی کی مُنقش جالیوں والی مَرقد آج بھی مرجعِ خلائق ہے۔ کہتے ہیں کہ اکبر نے اپنے لاڈلے بیٹے، بعد میں شہنشاہ جہانگیر کہلانے والے کا نام اُن ہی کے نام نامی سے مَنسوب کیا تھا لیکن شہزادہ سلیم کو اپنے شیخ کے نام سے پکارنے کو بے ادبی سمجھتے رہے۔ لہذا شہزادے کو ’’سلیم‘‘ نہیں ’’شیخو‘‘ پکارا کرتے تھے۔ اور شہنشاہ جہانگیر کے دور میں قائم ہونے والی لاہور کے قریب واقع شکارگاہ اِسی وجہ سے ’’شیخو پورہ‘‘ کہلاتی ہے۔

ممبئی کی ریل:۔

دہلی سے ہم لوگ بذریعہ ہوائی سفر ایک منفرد شہر بمبئی گئے۔ (جو اَب **ممبئی** کہلاتا ہے)۔ یہ جزیرہ نما

فرنگیوں کے ایک شہزادے کے لئے پُرتگیزی دُلہن پندرھویں صدی میں جہیز میں لے کر آئیں۔اور پھر دیکھتے دیکھتے یہ ہندوستان کی سب سے اہم بندرگاہ قرار پائی۔آج یہ شہر ہندوستان کی فلمی صنعت کے ایک اہم مرکز کے طور پر بھی پہچانا جاتا ہے۔ بے انتہا غربت اور بے انتہا دولت دونوں لحاظ سے اِس شہر کی اپنی اِنفرادیت ہے۔ مُغل راج کی شیرازہ بندی کو تاراج کرنے والی مرہٹہ طاقت بھی اسی علاقے سے اُبھری۔اور برصغیر میں پہلی ریل دُخانی طاقت سے چلی تو اِسی شہر بمبئی سے 1840ء میں قریبی شہر پونا کے لئے روانہ ہوئی۔بمبئی کو دیکھنے کا انداز جُدا جُدا تھا۔لیکن ہمارے ایک ساتھی پاکستان ریلوے کے آئی۔اے۔صدیقی نے ہم سے فرمائش کر دی کہ ہم اُن کے ساتھ جا کر بمبئی کا ریلوے سٹیشن دیکھیں۔ بظاہر ہمارے لئے یہ کسی طور پر کوئی دِلکش پیش کش نہیں تھی لیکن صدیقی صاحب کا دل رکھنے کے لئے ہم نے اُن کا ساتھ دینے کی حامی بھر لی۔انگریز راج کی دیگر بے شمار باقیات کی طرح یہاں کا ریلوے سٹیشن بھی بڑی آن بان رکھتا ہے لیکن سٹیشن کے باہر سے ہی عوام کے بے محابا اِژدِھام کو دیکھ کر ہمیں وہاں اندر جانا ہی ایک اچھی خاصی مشکل صورتِ حال دِکھائی دی۔ پلیٹ فارم ٹکٹ لینے والوں کی ایک انتہائی لمبی قطار آپ کا حوصلہ توڑ دینے کے لئے کافی تھی۔کوئی پندرہ بیس منٹ تک اِس کھڑکی پر کھڑے رہنے کے بعد صدیقی صاحب قطار سے نکل آئے اور فرمانے لگے ''آپ دو منٹ انتظار فرمائیں میں ایک حربہ استعمال کرتا ہوں''۔ ہم نے اِس انتظار سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے ساتھ والی دوسری کھڑکیوں پر نظر ڈالی۔ جہاں سے مسافر حضرات مختلف ریل گاڑیوں کے ٹکٹ خریدنے کے لئے قطاریں بنائے ہوئے تھے۔اِن لوگوں کے صبر اور ضبط کی ہم دل ہی دل میں داد دینے لگے تو ساتھ ہی ہم نے ہر کھڑکی کے اوپر روشنیوں میں لکھے ہوئے الفاظ دیکھے تو پتہ چلا کہ اِن میں مسافروں کی اطلاع کے لئے کمپیوٹر ریل کے ہر ڈبے میں موجود نشستوں اور لمحہ بہ لمحہ بھری جانے والی خالی جگہوں کی تفصیل بتاتا جا رہا تھا۔لہٰذا ساری کاروائی انتہائی شفاف انداز میں ہو رہی تھی اور ہر مسافر اطمینان کے ساتھ اپنی باری کا انتظار کر رہا تھا۔

اتنے میں صدیقی صاحب سٹیشن ماسٹر کو ساتھ لیے میرے پاس آئے۔مُختصر سا تعارف ہوا اور پھر سٹیشن ماسٹر کی رہنمائی میں ہم ریلوے سٹیشن کے اندر داخِل ہوئے۔ ہمارے رُوبرُو پٹڑی پر ایک ریل گاڑی روانہ ہونے کے لئے تیار کھڑی تھی۔''ارے یہ کیا؟۔ ایسا تو تکنیکی طور پر ناممکن ہے''۔صدیقی صاحب بڑبڑائے۔ ''تکنیکی صورتِ حال تو آپ تکنیکی لوگ ہی جانیں مگر حقیقت تو یہ ہے کہ آپ کے سامنے ایک ڈبل ڈیکر ریل کھڑی ہے

اور مسافروں کی آمد آمد ہے''۔ ہم نے کہا۔ سٹیشن ماسٹر نے ہماری رہنمائی کرتے ہوئے پلیٹ فارم سے نیچے ریل گاڑی کے زیرین ڈبے میں قدم رکھا۔ ہم نے اُن کی پیروی کی۔ نچلی نشستوں پر ایک نظر ڈالنے کے بعد سٹیشن ماسٹر کے پیچھے پیچھے ہم سیڑھیوں کے ذریعے اوپر والے ڈبے میں چلے گئے۔ تب کہیں جا کر صدیقی صاحب کی سمجھ بحال ہوئی۔ فرمانے لگے۔''ہاں یہ تو انہوں نے کمال کر دیا ہے۔ نچلے والے ڈبے کو عمومی سطح سے قدرے نیچے رکھ کر اُنہوں نے دونوں اوپر نیچے والی منازل کے لئے گنجائش نکال لی ہے''۔

بنگلور اور میسور میں:۔

بنگلور گئے تو معلوم ہوا کہ یہ شہر تو انتہائی خوبصورت ہے۔ یہاں کی سبزی و ہریالی یہاں کے گرم مرطوب موسم کی مرہونِ منت ہے۔ یہاں کے سب ہی باشندے مرد و زن خاصا مختصر لباس پہنے نظر آئے اور پھر سب یوں برہنہ پا پھرتے ہیں جیسے اِن کے جوتے چوری ہو گئے ہوں۔ ہم نے کئی حضرات کو انگریزی سوٹ پہنے برہنہ پا دیکھا تو سمجھ گئے یہاں کا موسم ان کے رسم و رواج کا مُستقِل حصہ بن چُکا ہے۔ اب تو یہ شہر تامل ناڈو صوبے میں واقع ہے لیکن ماضی میں یہ ریاست میسور کا حصہ تھا۔ اور اُس دور کے راجہ کا محل اپنی خوبصورتی اور دِلکشی میں کسی بھی یورپی شاہی محل سے کم نہیں۔

تاریخی شہر میسور بھی جانا ہوا۔ ہاں یہ اُس بَطلِ حُریّت نواب حیدر علی اور ٹیپو سُلطان فتح علی کا دارالحکومت ہے جنہیں ایک وقت تک فرنگی سامراج برصغیر جنوبی ایشیاء پر مکمل غلبہ حاصل کرنے میں سب سے بڑی رکاوٹ سمجھتا رہا۔ اپنی رعایا کی بہتری کے لئے کئے گئے اقدامات میں شہر کے قریب موجود پانی کا وہ ڈیم آج بھی موجود ہے جس پر ٹیپو سُلطان کے ہاتھ کا لگایا ہوا چھوٹا سا پتھر فارسی رسم الخط میں لکھی ہوئی تحریر کے ساتھ شیرِ مَیسور کی خدمات کی ہمیشہ یاد دِلاتا رہے گا۔ دونوں کے نام سے منسوب محلات اپنی بے انتہا سادگی کی اپنی مثال آپ ہیں۔ دونوں مجاہدوں کے مرقدوں پر حاضری نصیب ہوئی اور اُس زمانے کے نوادرات کو اِسی شہر میں موجود عجائب گھر میں دیکھا۔

قلعہ سُرنگا پٹم میں اپنوں کی وطن دُشمنی اور غداری کی مُنہ بولتی تصویر دیکھ کر خود اپنا گریبان چاک کرنے کو جی چاہتا ہے۔ قلعے کے نواح میں موجود گھروں کے مسلمان مکینوں سے گفتگو بھی ہوئی اور حیدر علی اور ٹیپو سُلطان کی اپنی رعایا میں ہر دلعزیزی اور وطن کی آزادی کی آرزو میں قربانی کی داستانیں سُننے کا اتفاق ہوا۔ ٹیپو کے لباس اور تلواروں کا ذِکر سکاٹ لینڈ میں میوزیم کی سیر کے سلسلے میں کر چکا ہوں۔ سامراج کے اِشارے پر لکھی ہوئی

تاریخ تو یہ بتاتی ہے کہ ایک فرنگی سپاہی سر ڈیوڈ بیرڈ عالمِ شباب میں سُر نگا پٹم کی پہلی لڑائی 1880ء میں سُلطان حیدرعلی کے مقابلے میں لڑتا ہوا قید ہوا اور پھر چار برس تک اِسی قلعے میں قید رہا۔ اِس نے زندان میں ہوتے ہوئے قلعے کا ایک تفصیلی نقشہ تیار کیا اور پھر پندرہ سال بعد میجر جنرل کی حیثیت سے 1899ء میں میسور کی چوتھی لڑائی میں ٹیپو کے خلاف یہی نقشہ استعمال کرتے ہوئے اُسے شکست دی۔ اِس تفصیل میں سلطان ٹیپو کے غدار اُمراء صادق اور دوسروں کے رول کا کوئی ذِکر نہیں۔ جن کے متعلق علامہ اقبالؒ بیان کرتے ہیں۔

جعفر از بنگال و صادق اَز دَکّن

ننگِ ملت ، ننگِ دین، ننگِ وطن

میسور میں ہمارا قیام وہاں کی مُقامی افسروں کی تربیتی اِکادمی میں ہوا۔ زیرِ تربیت افسران اتفاق سے کسی دورے پر باہر گئے ہوئے تھے۔ لاؤنج میں ہماری مُلاقات ایک مسلمان افسر اعجاز حُسین سے ہوئی جو اپنے دوسرے ساتھیوں کے ہمراہ بوجہ زخمی ہونے کے باہر نہ جاسکا تھا۔ بقول اُس کے وہ گھوڑے سے گر پڑا تھا۔ اُس نے بتایا کہ یہاں آنے سے پیشتر وہ ایک ضلع میں اپنے فرائض انجام دے رہا تھا۔ ہمارے دوست محسن خان نے اُس کی قابلیت کی تعریف کی تو کہنے لگا۔ ''بھئی میں ایڈمنسٹریٹو سروس میں اِس صوبے کا واحد مسلمان افسر ہوں۔ بات کچھ یوں ہوئی کہ موجودہ وزیرِ اعلیٰ تامل ناڈو جو تامل فلموں کے ایک سابقہ مشہور اداکار کی حیثیت سے بھی جانے پہچانے جاتے ہیں۔ جب اُس نے صوبے کے مسلمان عوام سے ووٹ مانگے تو اُس نے وعدہ کیا کہ برسرِ اقتدار آ کر وہ مسلمانوں کی اعلیٰ ملازمتوں میں شمولیت کے لئے ضرور کچھ کرے گا۔ لہٰذا جب وہ وزیرِ اعلیٰ بنا تو اُس نے صوبائی مُقنّنہ سے منظوری لے کر صوبے کی حد تک مسلمان اُمیدواروں کو بھی اَچھوتوں کے لئے مخصوص ایک فیصد کوٹے میں شامل کروا دیا۔ میری بھرتی اِسی ایک فیصد کوٹے کے ذریعے ممکن ہوسکی''۔ یاد رہے کہ بھارت میں سب سے اعلیٰ نوکر شاہی میں بھرتی خالص میرٹ کی بناء پر ہوتی ہے ماسوائے اَچھوت ذاتوں کے جن کے لئے ایک فیصد خصوصی کوٹہ مختص ہے۔

دُنیا کی اِس سب سے بڑی جمہوریت میں جہاں نسلِ آدم سینکڑوں ذاتوں، قبیلوں، قومیتوں اور برادریوں میں مُنقسم ہے۔ جہاں انسانیت آج بھی بے شمار مذاہب، فرقوں اور گروہوں کی باہمی رقابتوں میں مبتلا نظر آتی ہے۔ جہاں غربت و جہالت، توہمات اور بیماریوں نے مُستقل بسیرا ڈالا ہوا ہے۔ لیکن پھر بھی دُنیا کہتی ہے کہ مُستقبل یہاں کی آئندہ نسلوں کا درخشاں ہے۔ اِس خوش فہمی کی وجوہات آسانی سے سمجھ میں آجاتی ہیں

جب اِس عظیم تاریخی ورثہ کے امین دیس کو قریب سے دیکھنے کی کوشش کی جائے۔ بھارت کے دوراندیش نیتاؤں نے لازوال قربانیاں دے کر اس کی جنتا کو ایک مضبوط جمہوریت کی روایت بخشی ہے۔ اُنہوں نے محض گھریلو دستکاریوں کی پرورش سے آگے بڑھ کر مُلک میں ایک مضبوط صنعتی بُنیاد روزِ اوّل سے رکھ دی تھی۔ بڑی صنعتوں کو چلانے اور ٹیکنالوجی کے فروغ کے لئے قوم کو تیار کرنے کی خاطر اعلیٰ تعلیم کے بے شمار مراکز مُلک کے گوشے گوشے میں قائم کر دئے گئے ہیں۔ سرکاری سطح پر قوم کے مزاج کے عین مطابق شاہ خرچیوں کی بجائے سادگی اور بچت والی روایت کو ترویج دی گئی ہے۔ بُنیادی انفراسٹرکچر فراہم ہونے کے بعد اب اس بہت بڑے مُلک کے غریب عوام کی قسمت پھرنے میں صرف وقت کی قید ہی حائل نظر آتی ہے۔

دھاڑتے شیر کی کچھار۔ سنگاپور:۔

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے ہمارا مشن ایک بہت بڑے اور ایک بہت چھوٹے مُلک کے انتظام و انصرام کے حوالے سے تقابلی مطالعہ کرنا تھا۔ لہٰذا نئی دہلی سے ہمارا قافلہ سیدھا **سنگاپور** پہنچا جو بلا شبہ جنوب مشرقی ایشیاء کا سب سے چھوٹا مُلک ہے۔ جو دراصل دوسو بہتر مُربع میل پر واقع دنیا کی مَعدودے چند شہری ریاستوں میں سے ایک ہے۔ اس کے سابق سامراجی آقاؤں نے تو اِسے اس جگہ کی سٹریٹیجک محلِّ وقوع کی وجہ سے مصالحہ جات کی تلاش میں نکلنے والے بحری جہازوں کی آبی گزرگاہ پر واقع ایک دفاعی چوکی کے طور پر استعمال کیا۔ یہاں گزشتہ دوصدیوں کے دوران مختلف قوموں نے جن میں پُرتگیز، ولندیزی، انگریز، جاپانی اور ملائیشیئن سب شامل تھے، اپنے اپنے انداز میں حکمرانی کی۔ لیکن 1965ء میں حکومتِ خوداختیاری مِلنے کے بعد بڑے ہی ڈرامائی انداز میں یہاں کی صنعت وتجارت اور معیشت نے ایسا پلٹا کھایا کہ **سنگاپور** کے سب ہی اڑوس پڑوس کے مما لک انگشت بدنداں نظر آئے۔

آزادی کے بعد یوسف بن اسحاق یہاں کے پہلے صدرِ جمہور اور لی کوآن یُو اوّلین وزیرِ اعظم بنے اور 1959ء سے 1990ء تک وہی اِس نوزائیدہ مُلک کی راہبری کے فرائض انجام دیتے رہے۔ حکومت کا کنٹرول شروع دِن سے آج تک ایک ہی پارٹی یعنی عوامی ایکشن پارٹی کے ہاتھوں میں رہا۔ اور اِس اِسمِ بامُسمیٰ باعمل پارٹی نے اِس چھوٹے سے مُلک کی تقدیر بنادی۔

دراصل سنگاپور تریسٹھ عدد چھوٹے چھوٹے جزائر پر مشتمل ہے اور اِس کا مرکزی علاقہ پڑوسی مُلک ملائشیا کی ریاست سے سڑک اور ریل کے ذریعے جُڑا ہوا ہے۔ یہاں کی آبادی مختلف مذاہب کے پرستاروں اور کئی نسلوں پر مشتمل ہے۔ یہاں کی طرزِ حکومت جمہوریت اور مطلق العنانیّت کا ایک دِلچسپ مگر کارگر اِمتزاج ہے۔

لی کوآن یُو اور اُن کی پارٹی نے شروع دِن سے امورِ حکمرانی کو ایک انتہائی سنجیدہ منصب سمجھے رکھا۔ بظاہر معمولی فروگزاشتوں پر بھی انتہائی سخت سزائیں قانوناً دی جاتی تھیں اور اِن کے اِطلاق میں کسی قِسم کی رُو رِعایت نہیں بَرتی جاتی تھی۔ اِس کا نتیجہ یہ نکلا کہ سنگاپور چند ہی سالوں میں صنعت و حرفت کے میدان میں بڑے بڑوں کا پیشرو بن گیا۔ آج وہ دُنیا کا اُٹھارواں مُتموّل ترین مُلک سمجھا جاتا ہے۔ [1]

یہاں کے پاکستانی سفارت خانے نے ہمارے قیام کے لئے وسطِ شہر میں بلند و بالا طرزِ جدید کی عمارات اور اُن میں کام کرنے والے بڑے بڑے شاپنگ مالز کے جلو میں واقع ایک پُر آسائش ہوٹل میں ہماری بُکنگ کردی تھی جہاں سے یہاں کی برق رفتار زندگی کی ایک جھلک دیکھنے میں کوئی مُشکل حائل نہیں تھی۔ سرکاری کارپردازوں سے مُلاقات کے دوران ہمیں یہاں کے مختلف النسل باشندوں کے طرزِ معاش اور بود و باش کے متعلق معلومات سے لے کر طرزِ حکمرانی اور مُستقبل کے لئے بنائے گئے منصوبوں تک سب کُچھ کے متعلق تفصیل سے بتایا گیا۔ سنگاپور کے پاس خُشک زمین محدود ہے اور اِس کے محنتی باشندوں کے خواب لامحدود، لہٰذا سنگاپوریوں کی دلچسپی کا ایک خاص موضوع مُلحقہ سمندر کی لامحدود وسعتوں سے زمین کی دستیابی ہوتا ہے۔ آج سنگاپور سارے جہان میں فی مربع میل پر بسنے والی آبادی کی کثرت کے تناظر میں دوسرے نمبر پر ہے۔ 1960ء میں اِس کا رقبہ 582 مربع کلومیٹر تھا تو آج یہ 700 مربع کلومیٹر سے تجاوز کر چکا ہے۔ یہ زائد خطہءِ اراضی اِن بندگانِ خُدا نے اپنی محنتِ شاقہ کے زور پر پہاڑوں کو ہموار کر کے اور ساحلِ سمندر پر پانی کو پیچھے دھکیل کر حاصل کی ہے یا پھر اپنے پڑوسیوں سے معاہدات کے ذریعے۔

سنگاپور موسم کے لحاظ سے بھی اپنی ایک انفرادیت رکھتا ہے۔ اور وہ یوں کہ یہاں سال کے بارہ مہینے درجہ حرارت، ہوائی دباؤ اور ہوا میں نمی کا تناسب یکساں رہتا ہے۔ عموماً صبح کے وقت ہوا میں نمی 90% اور بعد دوپہر 60% تک رہتی ہے۔ اور کبھی تو یہ تناسب 100% ہو جاتا ہے۔ دِن رات کی طوالت بھی سارا سال تقریباً یکساں رہتی ہے۔ ہمیں تو یہاں کی ساری آبادی ایک عجیب قِسم کی یکسانیت کا شکار نظر آئی۔ حصولِ علم اور تکنیکی مہارت کی جستجو میں یہاں کی جوان نسل دیوانگی کی حد تک مشغول دِکھائی دیتی ہے اور کیوں نہ ہو، یہ مُلک ہانگ کانگ، جنوبی کوریا اور تائیوان کے دوش بدوش ایشیاء کا معاشی ببّر شیر کہلاتا ہے۔ وِکی پیڈیا میں دستیاب معلومات کے مطابق سنگاپور اس وقت غیر مُلکی زرِمبادلہ کی تجارت میں لندن، نیویارک اور ٹوکیو جیسے عظیم شہروں کے بعد دُنیا میں چوتھے نمبر پر ہے۔

اِس مثالی شہری ریاست کے مشہورِ زمانہ بازاروں چائنا ٹاؤن اور لِٹل اِنڈیا (چھوٹا ہندوستان) کی ہم

[1] وِکی پیڈیا ڈاٹ کام

نے خوب سیر کی۔ جدید سے جدید الیکٹرانک مصنوعات کی دُکانوں پر حاضری دی اور مقامی ریستورانوں میں ''ہینیس چکن رائس''، اور ''مِرچ لگے کریپ'' کی بھینی بھینی مہک سونگھی۔

ہمارے ایک ساتھی عطاء اللہ کا تعلق پاکستان کسٹمز سے تھا لیکن وہ کچھ عرصہ تک بَرسَلز (بیلجیئم) میں واقع عالمی تنظیم کسٹمز کوآپریشن کونسل (C.C.C.) کے صدر دفتر میں بھی رہ چُکے تھے۔ پاکستان میں اُن دِنوں بیرونِ مُلک سے آنے والی ہر چیز پر کسٹمز چارجز لگتے تھے لہٰذا اِس محکمے کی شان ہی جُدا تھی۔ عطاء اللہ صاحب کی فرمائش پر ہم سب کو کسٹمز کے صدر دفتر میں لے جایا گیا جہاں اُن کے ڈائریکٹر جنرل نے اپنے محکمے کی کارکردگی کے متعلق ہمیں بریف کیا۔ اب سنگاپور ٹھہرا ایک فری پورٹ جہاں تجارت مکمل طور پر آزاد تھی اور تقریباً ہر درآمدی شے بغیر کسی کسٹم ڈیوٹی ادا کئے مُلک میں آسکتی تھی۔ لہٰذا اِن حالات میں اِدارے کی وقعت بھی اتنی ہی تھی کہ اُن کا صدر دفتر شہر کے ایک چھوٹے سے ڈاک خانے کی پہلی منزل پر واقع اُسی ڈاک خانے کا کرایہ دار تھا اور اُس کا صدر دروازہ بھی ڈاک خانے کے پچھواڑے میں کُھلتا تھا۔ وہاں ہمیں بتایا گیا کہ اُس اِدارے کی ذمہ داری محض نشہ آور ادویات کی درآمد پر نظر رکھنے تک ہی محدود ہے۔

بیرونِ مُلک مطالعاتی دورے سے واپسی پر اِدارے کے سرپرستِ اعلیٰ سیکرٹری اسٹیبلشمنٹ کے سامنے اپنی متفقہ رپورٹ پیش کرنی تھی۔ عطاء اللہ زمانہءِ طالبِ علمی سے ایک اچھا مُقرّر رہا تھا اور اب بطورِ وکیل بھی اپنا مقدمہ اچھی طرح لڑ سکتا تھا۔ لہٰذا ہم سب نے اُسے اپنے رفقاء کی جانب سے یہ رپورٹ پیش کرنے کے لئے کہا۔ اُس نے حامی تو بھر لی لیکن اپنی مشکل یہ بتائی کہ اُس دِن وہ اپنی ایک بہت ہی ضروری ذاتی مصروفیت کی وجہ سے شاید نہ آسکے گا۔ اب اِسی ''شاید'' والی شرط سے نبٹنے کی خاطر اُس نے مجھ کمترین کو سب دوستوں کی منظوری کے ساتھ اپنا جانشین چُن لیا۔ ہماری جب کسی طور سے جان خلاصی نہ ہوسکی تو وقوعہ کے روز یہ نیابت بجا لانے کی تیاری شروع کر دی۔ مقررہ دِن جب صبح کے وقت جنابِ عطاء اللہ نہ آئے تو سب کی نظریں ہم پر لگ گئیں۔ تقریب کے انعقاد کا وقت دوپہر ڈھائی بجے مقرر کیا گیا تھا۔ گرمیوں کے دِن تھے۔ جونہی ہم نے دوپہر کا کھانا نوشِ جان فرمایا اور اپنے کمرے میں تھوڑی دیر تک اِستراحت کے لئے گئے تو ہماری آنکھ لگ گئی اور کم بخت کُھلی بھی تو تین بجنے والے تھے۔ پریشانی کے عالم میں مُنہ پر پانی کے دو چھینٹے مارے اور تیزی سے اپنے کلاس روم کی جانب لپکے۔ دیکھا تو سیکرٹری صاحب جناب آفتاب احمد خان کُرسیءِ صدارت پر جلوہ افروز ہیں۔

ہماری روح نکلنے ہی والی تھی کہ اگلے لمحے ہم نے ایک جانب سے عطاء اللہ کی آواز سُنی ۔ بھائی صاحب روسٹرم دونوں ہاتھوں سے تھامے بڑی دِل جمعی سے اپنی رپورٹ پیش کررہے تھے۔ہم چُپکے سے ایک خالی نشست پر براجمان ہوگئے اور اپنی قسمت پر نازاں ربِّ ذوالجلال کا شُکر ادا کرنے لگے۔عطاء اللہ کی رپورٹ واقعی قابلِ شُنید تھی۔معلوم ہوتا تھا حضرت کئی روز سے اِس کی ریہرسل فرمارہے تھے۔ملازمت چھوڑنے کے بعد یہ حضرت میدانِ سیاست میں کود پڑے۔صوبائی اسمبلی کے انتخابات میں ایک مضبوط اُمیدوار کی حیثیت سے سامنے آئے لیکن غالباًحسبِ معمول اُن کی تیاری مکمل نہیں تھی کامیابی حاصل نہ کرسکے۔

راجیو گاندھی کی ناراضگی:۔

1985ء میں ڈھاکہ (بنگلہ دیش) میں جنوبی ایشیائی ممالک کی علاقائی کانفرنس (سارک) کا سربراہی اِجلاس منعقد ہوا۔اس موقع کی مناسبت سے ممبر ممالک کی ڈاک کی تنظیموں نے سارک کے موضوع پر یادگاری ڈاک ٹکٹ جاری کیئے اور ڈھاکہ ہی میں اِن ٹکٹوں کی نمائش کا انتظام بھی کیا گیا۔ جب سربراہانِ حکومت اِس نمائش کا دورہ کرنے لگے تو اُس وقت کے بھارتی وزیرِ اعظم آنجہانی راجیو گاندھی نے پاکستانی ڈاک ٹکٹوں کے اِجراء پر ناراضگی کا اظہار فرمایا۔اُنہیں شکایت تھی کہ اِن ٹکٹوں پر علاقائی ممالک کے نقشے میں ’’کشمیر‘‘ کو متنازعہ علاقہ دِکھایا گیا تھا جبکہ بھارت ریاست جموں کشمیر کو اپنے مُلک کا اَٹوٹ اَنگ قرار دیتا ہے۔ اِس سفارتی تنازعہ کا حل تب ہی ممکن ہوسکا جب صدرِ پاکستان نے واقعہ کی تحقیق کرنے کا عندیہ دیا۔ بعد میں پاکستان پوسٹ آفس کے ڈائریکٹر جنرل کو وزارتِ خارجہ طلب کیا گیا۔ اتفاق سے اُس وقت کے سیکرٹری خارجہ امور عبدالستار صاحب قبل ازاں بھارت میں سفیرِ پاکستان رہ چُکے تھے اور اُن ہی دِنوں پاکستان پوسٹ کے محمد خورشید صاحب عالمی تنظیمِ ڈاک (یو۔پی۔یو) کی جانب سے نئی دہلی میں خدمات انجام دے رہے تھے۔لہٰذا دونوں حضرات کی پہلے سے شناسائی تھی۔ چائے کی میز پر بیٹھے عبدالستار صاحب نے خورشید صاحب سے ڈھاکہ میں پیش آنے والے واقعہ کا ذِکر کیا۔خورشید صاحب نے پوچھا’’ کیا کشمیر پاکستان اور بھارت کے درمیان متنازعہ علاقہ گردانا نہیں جاتا؟‘‘۔’’یہی شروع سے ہمارا موقف ہے‘‘۔ستار صاحب نے جواب دیا۔ دونوں نے مُسکراتے ہوئے ایک دوسرے سے رُخصت مانگی لیکن پھر کچھ دِن بعد خورشید صاحب نے قبل اَز وقت حکومتی ذِمہ داریوں سے ہمیشہ کے لئے رُخصت چاہی جو منظور ہوگئی اور یوں اگلے سینئر موسٹ افسر سید فاخر حسن پاکستان پوسٹ آفس کے ڈائریکٹر جنرل مقرر ہوگئے۔

اُدھر ہم نے چار ماہ کا نیپا کورس مکمل کیا۔ حیدر آباد پہنچے تو اسلام آباد سے ہمارے ڈپٹی ڈائریکٹر جنرل (پرسونیل) محمد اختر صاحب نے ہمیں فون پر بتایا کہ فاخر صاحب نے بحثیت ڈائریکٹر جنرل چارج لے لیا ہے اور ساتھ ہی ہمارا تبادلہ حیدر آباد سے اسلام آباد بحثیت ڈپٹی ڈائریکٹر جنرل (آپریشنز) کر دیا ہے۔ یوں بھی فاخر صاحب کو اندرونِ سندھ کو کراچی شہر سے علیحدہ کرنا اچھا نہیں لگتا تھا لیکن اب جو ہو چکا تھا سو ہو چکا تھا لیکن بحیثیت ڈائریکٹر جنرل کے سوئٹزرلینڈ کے پہلے ہی دورے میں اُن پر عالمی تنظیم ڈاک اور بیرونِ مُلک سروسز کی اہمیت واضح ہو چکی تھی لہٰذا وہ ہم سے وہی کام لینا چاہتے تھے جو ہم عرصے سے کرتے آ رہے تھے۔

قِصّہ نئی دُلہن کا:۔

اپنے تبادلے کی اطلاع ملتے ہی ہم نے چند روز میں آنے والی عید کی تعطیلات کے پیشِ نظر بمع اپنے اہلِ خانہ کے فوراً حیدر آباد کو خیر باد کہنے کا فیصلہ کر لیا۔ اِس سلسلے میں ریل کی سیٹوں کی بُکنگ کرا دی۔ اُدھر فاخر صاحب کا اچانک اسلام آباد سے فون آیا۔ فرمانے لگے "کیا آپ نے آج کا روزنامہ "جنگ" دیکھا ہے؟ اِس اہم قومی اخبار نے آپ کے ایک افسر کی عیاشیوں اور شہ خرچیوں پر ایک اِداریہ لکھا ہے۔ اِس سلسلے میں فوراً تحقیقات کرائیے اور ہمیں رپورٹ بھیجیں۔" ہم نے اخبار منگوا کر اِداریہ پڑھا۔ تحریر تھا کہ "حیدر آباد کے ایک جونیئر افسر اپنی نئی شادی کے بعد اپنی سرکاری ذمہ داریوں کو پسِ پُشت ڈال کر ہنی مون منا رہے ہیں اور اس سلسلے میں اپنے ماتحتوں کو ناحق پریشان کر رہے ہیں"۔ پہلی ہی نظر میں یہ خبر ہمیں بات کا بتنگڑ بنانے کی بہترین مِثال دِکھائی دی۔ لیکن ایک تو ایک اہم اخبار کا اِداریہ تھا اور پھر فاخر صاحب کا حُکم۔ لہٰذا ہم نے فوراً اپنے ایک تجربہ کار افسر کو فوری تحقیق پر مامور کر کے اُسے شام تک رپورٹ پیش کرنے کو کہا۔ معلوم ہوا کہ یہ افسر موصوف کی دوسری شادی تھی اور سندھی معاشرے میں یہ بات قطعاً معیوب نہیں تھی۔ لیکن فاخر صاحب کا کیا کیا جائے۔ اُنہیں ہمیشہ "دوسری شادی" کے ذِکر سے چِڑ تھی۔ دراصل وہ خود اولاد کی دولت سے محروم تھے اور اُن کے اکثر دوست احباب اُنہیں "دوسری شادی" کی ترغیب دیتے رہتے لیکن شاباش اُن کی قوتِ اِرادی پر۔ اُنہوں نے ایسی ویسی تجاویز کو کبھی درخورِ اعتنا نہ سمجھا۔ ہم نے تحقیقاتی افسر کی رپورٹ مَن وعَن اُن کی خدمت میں بھجوا دی اور خود اسلام آبادئی ذمہ داریوں سے عُہدہ برآ ہونے کے لئے روانہ ہو گئے۔ فاخر صاحب کو ہماری رپورٹ قطعاً نہ بھائی اور اُس نئے شادی شُدہ افسر کو پہلے معطّلی کا پروانہ اِرسال کیا اور پھر ملازمت سے فراغت کا۔ بڑی مشکل سے کوئی پانچ برس کی عدالتی چارہ جوئی کے بعد اُس کی ملازمت بحال ہو سکی۔

باب سیزدہم

ڈاک کی خصوصی خدمات کا اِجراء:۔

دسمبر 1978ء میں جب پاکستان میں آنے والی پہلی پرائیویٹ غیر مُلکی کوریئر کمپنی کے دوارکان ہم سے ہمارے کراچی صدر میں واقع دفتر میں ایک درخواست لئے مِلنے آئے تو کسی کے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ آئندہ چند برس میں ڈاک کی سہولیات کا ایک معتدبہ حصّہ اب درجنوں مختلف پرائیویٹ کمپنیاں مُہیا کریں گی۔ یہ حضرات کچھ ترقی یافتہ ممالک کی طرح پاکستان میں بھی تجارتی بُنیادوں پر کاروبار شروع کرنے کے لئے اجازت نامہ چاہتے تھے۔ چونکہ معاملہ ترقی پذیر پاکستان میں غیر مُلکی سرمایہ کاری کا تھا لہٰذا حکومتِ وقت اِن کی ہر ممکن حوصلہ افزائی کرنا چاہتی تھی۔ ہم اُن کی درخواست لے کر اپنے سربراہِ اِدارہ سید اطہر محمود کے پاس گئے تو وہ تھوڑی دیر سوچنے کے بعد فرمانے لگے۔ ''آنے والے سیلاب کو کون روک سکتا ہے؟''۔ زیادہ سے زیادہ ہم اُن سے کہہ سکتے ہیں کہ وہ اپنے ہاں سے بُک ہونے والے ہر پیکٹ پر ہمارے کم سے کم نرخ برائے خط وکتابت یعنی 20 پیسے کا ڈاک ٹکٹ لگا دیا کریں۔ ویسے بھی 20 پیسے کی چیز 100 روپے میں اُن کے ذریعے وہی بھیجے گا جو واقعی پریشان حال ہو''۔ بہرحال ہم نے یہ تکلف بھی رَوا نہ رکھا اور اِس بات پر اصرار کیا کہ پوسٹ آفس ایکٹ 1898 کے مطابق کوئی بھی شخص یا اِدارہ ڈاک لانے لے جانے کا کام نہیں کرسکتا اور جو خطوط لانے لے جانے کا کاروبار نہ کرے وہ تو کچھ بھی کرسکتا ہے۔ جس سے ہمیں کوئی سروکار نہیں۔ لہٰذا اُس روز سے ہر نئی قائم ہونے والی کوریئر کمپنی نے یہ تحریری عہد نامہ دستخط کرنا شروع کردیا کہ وہ ''پوسٹ آفس ایکٹ'' کی قطعاً خلاف ورزی نہیں کریں گے لیکن بقولِ کسے ''وہ وعدہ ہی کیا جو وفا ہوگیا''۔

جون 1986ء میں جب ہم نے پاکستان پوسٹ آفس کے ڈپٹی ڈائریکٹر جنرل (آپریشنز) کا قلمدان سنبھالا تو ہمارے نئے ڈائریکٹر جنرل سید فاخر حسن صاحب نے دوسرے مُستعد پوسٹل ایڈمنسٹریشنز کی پیروی کرتے ہوئے پاکستان ڈاک کی اپنی خصوصی خِدمات شروع کرنے کا فیصلہ کیا۔ اِس طرح آئندہ ایک سال کے عرصے میں کوئی دس عدد خصوصی خِدمات کا اِجراء کیا گیا جن میں نصف تیز تر ترسیلِ ڈاک سے متعلق تھیں جبکہ باقی بینکنگ اور تَرسیلِ زر کو جدید تقاضوں کے مطابق بنانے کے بارے میں تھیں۔ اِن سب خدمات کو کامیابی سے

ہمکنار کرنے کی خاطر اِنفرا سٹرکچر، اَفراد کی ٹریننگ اور ضروری مالی وسائل مہیا کرنے کی ذِمہ داری ہمارا ہی کام ٹھہرا۔ ہرنئی سروس کا اِجراء مُلک بھر کے اہم شہروں میں مقبول عوامی نمائندوں اور حکمرانانِ وقت کے ہاتھوں کروا یا گیا۔ اِس سلسلے میں ہمارے دفتر کے رفقائے کار میاں افتخار الدین، محمد رازی، محمد نجیب، محمد عظیم اور عبدالمجید صاحب کی محنت اور کام سے دِلی لگن کے علاوہ محکمے کے سب ہی افسران اور کارپردازوں کے بھرپور تعاون سے یہ سب کچھ ممکن ہوسکا۔ پوسٹ آفس کی اِس سلسلے میں اِجارہ داری قائم رکھنے کی تمام تر کوششیں وقت کی رفتار کا مقابلہ نہ کرسکیں۔ آخر میدان اُسی کے ہاتھ رہنا تھا جو بہتر نتائج دِکھا سکے۔

عالمی تنظیمِ ڈاک کے سربراہ کی پاکستان آمد:۔

برازیل سے تعلق رکھنے والے یونیورسل پوسٹل یونین کے سربراہ ''باٹوڈاباروز'' فاخر صاحب کی دعوت پر اپنی بیگم کے ہمراہ پاکستان کے دورے پر آئے تو اُن کے ساتھ کام کرنے والے پاکستان کے اعجاز حیدر بطورِ ترجمان اُن کے ساتھ آئے۔ معزز مہمان کی چونکہ مادری زبان پُرتگیزی تھی لہٰذا ہسپانوی اور فرانسیسی کے علاوہ وہ کسی دوسری زبان سے نابلد تھے۔ ہم نے اُنہیں اپنی نئی خصوصی ڈاک کی خدمات کے اِجراء کے بارے میں بریف کیا تو فرمانے لگے ''میں یہ کام اپنے مُلک برازیل میں کرچکا ہوں اور اِن سے متعلق مشکلات سے آگاہ ہوں۔ لیکن اب حکومتی خول سے نکل کر کاروباری میدان میں مقابلہ کرنے کے بغیر چارہ نہیں''۔ اعجاز حیدر صاحب ساتھ ہوتے تو مُعزز مہمان کو سنبھالنے میں کوئی دِقت نہیں ہوتی تھی لیکن وہ حضرت تھوڑی دیر کے لئے بھی اِدھر اُدھر ہوجاتے تو فاخر صاحب ہماری ٹوٹی پھوٹی فرانسیسی کا سہارا لیتے۔ بدقسمتی سے اُن کا خیال تھا کہ ہم بڑی اچھی فرانسیسی بول لیتے ہیں۔ اِس غلط فہمی کی وجہ یہ تھی کہ خود باٹو صاحب کی فرانسیسی بھی واجبی سی تھی۔ اسلام آباد، مری اور تربیلا وغیرہ کی سیاحت کے دوران تو ہماری چل جاتی تھی لیکن مُشکل اُس وقت پیش آئی جب اُس وقت کے وزیرِ مواصلات محمد اسلم خٹک سے اُن کے گھر پر اُن کی ملاقات کے لئے ہم لوگ پہنچے تو کسی وجہ سے اعجاز حیدر صاحب پیچھے رہ گئے۔ اسلم خٹک صاحب ہمارے پڑوس ہی میں تو رہتے تھے لہٰذا اُن کے انتخابی حلقے سے آئے ہوئے سینکڑوں ملنے والوں سے اپنے مہمان کو بچا کر خٹک صاحب کے گھر کے پچھواڑے سے اُن کے مہمان خانے تک پہنچنا تو قطعاً مشکل نہیں تھا لیکن دونوں کی باضابطہ رسمی گفتگو کے دوران ترجمانی کے فرائض ادا کرنا ہمارے لئے خاصی پریشانی کا سبب بن سکتا تھا۔ ہم نے وزیر موصوف کو دیکھتے ہی بتا دیا کہ ہمارے معزز مہمان صرف فرانسیسی سمجھ لیتے ہیں۔ ہماری حیرت کی انتہا نہ رہی جب

خٹک صاحب کی زبان سے فرانسیسی میں اِستقبالیہ الفاظ نکلے اور اُنہوں نے فَر فَر بولنا شروع کر دیا۔ اِس پر ہم نے نہ صرف سُکھ کا سانس لیا بلکہ اعجاز حیدر صاحب کو دِل ہی دِل میں کوسنا فوراً بند کر دیا۔ بات چیت کے بعد سب لوگ باہر نِکلے تو ہم نے اسلم خٹک صاحب کو پشتو میں اُن کی زبان دانی پر مبارک باد دی تو فرمانے لگے۔ ''میاں ہم بھی کبھی جوان ہوتے تھے تو جوانانِ وقت کی زبان بولتے تھے اب برسوں بعد اِس بڑھاپے میں کام آئی''۔ یاد رہے کہ اسلم خٹک صاحب انگلستان کی مشہور تاریخی یونیورسٹی کیمبرج سے تعلیم یافتہ تھے اور وہاں پر 1930ء کے عشرے میں زیرِ تعلیم دیگر برصغیرِ ہندوپاکستان کے طالبِ علموں کے ہمراہ تحریکِ پاکستان میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے رہے۔ حتیٰ کہ انگلستان سے شائع ہونے والے اُس مشہور تاریخی کتابچے ''ابھی یا کبھی نہیں'' پر چوہدری رحمت علی کے ساتھ اُن کے بھی دستخط ہیں۔ اِسی کتابچے میں نوجوانانِ کیمبرج نے مُسلمانانِ ہند کے لئے ایک نئے مُلک کی تجویز کے ساتھ ساتھ نئی ریاست کا نام ''پاکستان'' تجویز کیا تھا۔

مُلاقات ایک سادہ لوح وزیرِ اعظم سے:۔

عالمی تنظیمِ ڈاک کے سربراہ کی ایک مُلاقات وزیرِ اعظم پاکستان جناب محمد خان جونیجو سے بھی طے تھی۔ لہٰذا ہم اُنہیں راولپنڈی میں وزیرِ اعظم ہاؤس لے گئے۔ وزیرِ مواصلات محمد اسلم خان خٹک اور ڈائریکٹر جنرل پوسٹ سید فاخر حسن ہمراہ تھے۔ پروٹوکول کے سارے ضابطے پورے کرتے ہوئے ہم ملاقات کے کمرے میں پہنچے۔ وزیرِ اعظم صاحب سفید شلوار قمیض زیب تن کئے اور قراقلی ٹوپی سر پر سجائے اپنے مہمانوں سے بڑی خندہ پیشانی سے مِلے۔ تعارفی الفاظ کے بعد ترجمان کے توَسط سے عالمی تنظیمِ ڈاک کی کارگزاری۔ پاکستان کے نئے رائج کردہ خصوصی ڈاک خِدمات اور عالمی ڈاک کی مدد سے قائم کردہ پوسٹل سٹاف کالج اسلام آباد۔ دوسرے ترقی پذیر ممالک میں پاکستانی ڈاک ماہرین کی خدمات اور نامہ بَروں کی بیرونِ مُلک ٹریننگ کے بارے میں اُنہیں بتایا گیا۔ جونیجو صاحب بظاہر بڑی توجہ سے ساری گفتگو سُنتے رہے۔ ایک موقع پر ترجمے کے دوران اسلم خٹک صاحب نے ترجمان کی اِصلاح کرتے ہوئے ایک لفظ کے مختلف معنی بتائے تو جونیجو صاحب ہنس پڑے اور فرمایا۔ ''خٹک صاحب۔ آپ تو چُھپے رُستم نِکلے''۔ خٹک صاحب نے جواباً فرمایا۔ ''آپ کبھی ہمیں بھی موقع دیں۔ ساری فارن پالیسی اور ڈپلومیسی تو صاحبزادہ یعقوب کے پاس رگروی رکھی ہوئی ہے''۔ یاد رہے کہ صاحبزادہ صاحب بے شمار غیر مُلکی زبانوں کے ماہر سمجھے جاتے تھے اور وہ ایک سابق فوجی جنرل ہوتے

ہوئے بھی جونیجو صاحب کی کابینہ میں وزیرِ خارجہ کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ جونیجو صاحب کے بولنے کی باری آئی تو اُنہوں نے ڈائریکٹر جنرل یونیورسل پوسٹل یونین سے ایک بڑی مُلتمسانہ گزارش کی۔ فرمانے لگے ''میرا تعلق صوبہ سندھ کے ایک دیہی علاقے سے ہے۔ ہمارے گاؤں میں ایک چھوٹا سا ڈاکخانہ بھی ہے۔ وہاں باہر سے آنے والے منی آرڈر عموماً دیر سے لوگوں کو مِلتے ہیں۔ برائے کرم اس کا کچھ کیجئے تا کہ لوگوں کی یہ تکلیف دور ہو سکے''۔ باٹو ڈاباروز نے پریشانی میں فاخر صاحب کی طرف دیکھا اور اُنہوں نے میری طرف۔ ہمیں فوراً اصل صورتِ حال یاد آ گئی۔ جو ایک روز پوسٹماسٹر جنرل سندھ کی حیثیت سے ضلع تھر پارکر میں واقع جونیجو صاحب کی زمینوں سے گزرتے ہوئے شیخ قمر جمیل نے ہمیں بتائی تھی کہ کس طرح وہاں جونیجو صاحب کے والد بزرگوار کے نام سے ایک گاؤں آباد ہے اور اُن ہی کے نام سے وہاں ایک دیہاتی ڈاک خانہ کام کر رہا تھا۔ جونیجو صاحب کے وزیرِ اعظم بننے کے بعد اُن کے مزارعوں نے دیہی پوسٹماسٹر کو تنگ کرنا شروع کیا تو وہ اپنا سامان اُٹھا کر ساتھ والے گاؤں کے زمیندار کے پاس چلا گیا، جس نے اُسے بہتر سہولیات فراہم کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ یہ تو دیہی زندگی کی مقامی سیاست تھی اور یہ مسائل ظاہر ہے عالمی سطح پر اُٹھانے سے حل نہیں کئے جا سکتے تھے۔ بہرحال ہم نے اُن کی شکایت پر کان دھرنے کا وعدہ کیا اور اُن سے رُخصت چاہی۔ ایک بات واضح تھی کہ ہم وزیرِ اعظم کے لئے تیار کردہ اِختصاریہ میں اقوامِ متحدہ کے ڈاک سے متعلق قائم اِدارے کے سربراہ کے دورہ پاکستان کے اصل مقصد کی صحیح وَضاحت نہیں کر سکے تھے یا جونیجو صاحب اُسے پڑھنے کے لئے وقت نہیں نکال سکے تھے۔

ایک زیرک جرنیل اور متواضع شخصیت:

جنرل ضیاء الحق اسلام آباد میں نئے تعمیر شدہ ایوانِ صدر کو آباد کرنے والے اولین صدرِ مملکت تھے۔ اُنہیں یہاں آئے ابھی چند روز ہی ہوئے تھے کہ بھارتی سیکرٹری پوسٹ بھارت اور پاکستان کے درمیان ڈاک کے تبادلے کے حوالے سے بقایا جات پر بات کرنے کے لئے پاکستان آئے۔ ضیاء الحق صاحب بھارت سے آنے والے ہر وفد کی ذاتی طور پر پذیرائی کا اہتمام کرتے تھے۔ اِس موقع پر بھی یہی ہوا۔ ہم مہمان سیکرٹری کو لے کر اپنے سیکرٹری مواصلات حق نواز اختر اور فاخر حسن کے ہمراہ ایوانِ صدر پہنچے تو بھارتی سفیر انتظار گاہ میں موجود تھے۔ اب ضیاء الحق صاحب کی متعارف کی ہوئی اِصلاحات میں ایک چیز قومی لباس پہن کر سرکاری تقاریب میں شرکت کرنا تھا۔ دراصل سب سرکاری اہل کاران کے لئے دفتروں میں حاضری

اسی لباس میں ضروری قرار دی گئی تھی۔ ہم سب نے عموماً شلوار قمیض کے ساتھ واسکٹ پہن کر دفاتر میں حاضری شروع کر دی تھی لیکن اب سردیوں کے دِنوں میں صدرِ مملکت خود شیروانی میں ملبوس سینے پر جیبی گھڑی سجائے نظر آتے تھے۔ لہٰذا ہم نے بھی اپنے اسلامیہ کالج کے زمانے کی سیاہ شیروانی کو نکال کر برش کرنا شروع کر دیا۔ بدقسمتی سے یہ آثارِ قدیمہ کچھ کچھ تنگ محسوس ہونے لگی تھی۔ ہمارے ایک نوجوان ساتھی مہتاب نقوی نے اپنی شیروانی پیش کی تو ہم نے اُن کی یہ پیش کش فوراً قبول کر لی کیونکہ اُن کی اَچکن مقابلتاً عمدہ اور نئی نظر آئی۔ لیکن شومئی قسمت مہتاب صاحب قدرے فربہ جسم سے نوازے گئے تھے اس لئے اُن کی بہتر اَچکن ذرا کُھلی ڈُھلی محسوس ہوئی لیکن بہر حال ہم اپنے دوسرے ساتھیوں کے ہمراہ یہی لباس پہنے ایوانِ صدر پہنچ گئے۔ جنرل صاحب اپنی مخصوص مُسکراہٹ کے ساتھ اپنی روایتی انکساری اور تواضع کے ساتھ ہر آنے والے مہمان سے ہاتھ مِلائے جا رہے تھے۔ ہم سے ہاتھ مِلانے لگے تو نہ جانے کیسے ہمیں یوں لگا جیسے پوچھ رہے ہوں۔ ''میاں یہ شیروانی زندگی میں پہلی دفعہ پہنی ہے کیا؟''۔ اور ہم دل ہی دل میں جواب دے رہے تھے۔ ''اِسلامیہ کالج میں پورے چار سال صرف آج کے دِن آپ کے دربار میں حاضری دینے کی خاطر مشق کرتے رہے ہیں۔ لیکن اِس دوران عمرِ عزیز کے تیس برس بیت گئے ہیں''۔ لیکن دوسرے ہی لمحے اُن کی دلفریب مسکراہٹ کو دیکھ کر ساری کوفتیں یکدم دور ہو گئیں۔

جونہی اُنہیں مہمانِ خصوصی کے تعارف کے ساتھ اُن کا عہدہ سیکرٹری پوسٹ بتایا گیا۔ اُنہوں نے حق نواز اختر صاحب کی طرف دیکھتے ہوئے فرمایا۔ ''اختر صاحب سُن رہے ہیں آپ۔ یہ محکمہ آپ کی وزارت سے جُدا بھی ہو سکتا ہے''۔ ہمارے ہاں کے سب طالع آزما قائدین کی طرح جنرل صاحب بھی سفارت کاری میں اپنی بہترین صلاحیتیں آزمانے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ جب باوجود اُن کی خواہش کے بھارتی نیتاؤں نے اُن سے پیار کی پینگیں بڑھانے سے اجتناب کیا تو اُنہوں نے کرکٹ کے کھیل کو بطور سفارتی ہتھیار استعمال کرنے کی ٹھان لی اور دونوں مُلکوں کے درمیان ہونے والے کرکٹ میچ بھارتی سرزمین پر دیکھنے کی خواہش کا اظہار کر دیا جسے بھارتی سرکار ٹال نہ سکی۔ ہماری موجودگی میں اِس ملاقات میں بھی بھارت اور پاکستان کے تعلقات بڑھانے کے لئے مواصلاتی رابطوں کی بہتری کے لئے بات ہوئی۔ بھارتی سفیر سے جو اُردو اور فارسی ادب سے خاصا لگاؤ رکھتے تھے جنرل صاحب کی بڑی دلچسپ گفتگو ہوئی۔ اُن دِنوں فیکس کی سہولت ایک نئی ٹیکنالوجی کے طور پر سامنے آ رہی تھی۔

بھارتی سفیر نے صدر صاحب سے اپنے سفارت خانے کے لئے یہ سہولت استعمال کرنے کی اجازت چاہی جس کے لئے صدر صاحب نے اختر صاحب کو خصوصی ہدایات دیں لیکن بھارتی سفیر سے برابر دِل لگی کرتے ہوئے فرمانے لگے۔ ''ہم اجازت دیں بھی تو بھی آپ شکایت کرتے رہیں گے کہ ہم نے اس رابطے پر بھی جاسوس بٹھا رکھے ہیں''۔ بھارتی سیکرٹری پوسٹ سے اُنھوں نے اُن کے پاکستان پوسٹ کے ساتھ مالی اُمور پر بات چیت کی پروگریس دریافت کی۔ یوں پتہ چلا کہ اُنھوں نے بڑی دلچسپی سے ہماری اِس ملاقات کے بارے میں اُنہیں اِرسال کردہ سمری پڑھ لی تھی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ ہمارے مہمان جب لاہور سے دہلی کے لئے روانہ ہوئے تو جنرل ضیاء الحق کی جانب سے وہاں پر ایک عدد پاکستان کے بنے ہوئے قالین کا خصوصی تحفہ اُن کے حوالے کرنے کے لئے اُن کے اے۔ڈی۔سی لاہور ایئرپورٹ پہنچے ہوئے تھے۔

یوں تو جنرل صاحب کے دیدار کے بے شمار مواقع ملتے رہتے تھے۔ اُن کی حاضری خصوصی طور پر سالانہ حج کانفرنسوں میں لازمی ہوتی تھی۔ اِس موقع پر حاضرین میں علماء و مشائخ۔ حج انتظامات سے دلچسپی لینے والے اہلِ رائے حضرات اور ہم جیسے خادمین سرکاری ملازمین سب ہی شامل ہوتے تھے اور جنرل صاحب بڑے تپاک سے سب حضرات سے فرداً فرداً ہاتھ مِلانے کی کوشش کرتے تھے۔ آخری دفعہ اُنہیں 14 اگست 1988ء کو قصرِ صدارت کے سبزہ زار پر مُلک کے یومِ آزادی کی تقریب سے خطاب کرتے ہوئے دیکھا۔ اِتفاق سے اُس وقت زوروں پر بارش برس رہی تھی۔ سب قناتیں برابر ٹپک رہی تھیں۔ اور ہم حاضرین بھی اچھے خاصے بھیگے ہوئے تھے مگر جنرل صاحب برابر اپنا پیغام پڑھے جا رہے تھے۔ حسبِ معمول شیروانی میں ملبوس تھے اور اُن کے اے۔ڈی۔سی نے ایک عدد چھتری اُن کے سر پر تان رکھی تھی۔ عین تین روز بعد یعنی 17 اگست کو ہم نے وہ المناک خبر سُنی کہ ضیاء الحق صاحب صدرِ پاکستان اپنے کئی دوسرے ساتھی جرنیلوں اور امریکی سفیر کے ہمراہ بھاول پور کے قریب ایک فوجی مشق دیکھنے کے بعد طیارے میں اسلام آباد آتے ہوئے حادثے کا شِکار ہو گئے۔ اور یوں مُلکی تاریخ کا ایک اور باب بند ہو گیا۔ شاید اِستعماری طاقتوں کو اُن کی مزید ضرورت نہیں رہی تھی یا شاید قدرت کو یہی منظور تھا کہ پاکستانی قوم کو اپنا مقدر دُرست کرنے کا ایک اور موقع دیا جائے۔

عوامی جمہوریہ چین کا بیجنگ:

اگست 1987ء میں ہمیں جنوب مشرقی ایشیائی ممالک کی پوسٹل یونین کے انتظامی امور کے متعلق

ہونے والے سالانہ اجلاس میں پاکستان کی نمائندگی کرنے کے لئے کہا گیا تو نہ جانے کیوں ہمیں اپنے نبی اُمیؐ کی وہ مشہور حدیث بار بار یاد آتی رہی جس میں فرمایا گیا ہے کہ ''علم حاصل کرو خواہ اِس کے حصول کے لئے تمہیں چین ہی کیوں نہ جانا پڑے''۔ یہ حقیقت تو ہم پر اُس وقت منکشف ہوئی جب ہمیں بتایا گیا کہ کس طرح اَصحابِ رسولؐ اور بعد میں آنے والے متلاشیانِ حق اور مبلغینِ دین سرزمینِ چین اور متعلقہ چینی تُرکستان کو خصوصی اہمیت دیتے رہے اور تاریخی ثبوت کے طور پر آج بھی نامور اور اولوالعزم صحابیِ رسولؐ حضرت سعدؓ بن ابی وقاص کی مرقد صدیوں سے بیجنگ کے نواح میں مرجع خلائق ہے۔

چین اور پاکستان کی دوستی کے ترانے سُن کر ویسے بھی دُنیا کے اُس سب سے بڑی آبادی والے مُلک کو دیکھنے اور وہاں کے انتہائی محنتی اور باہمت عوام کو ہدیہءِ تہنیت پیش کرنے کو دِل چاہتا ہے۔ لہٰذا جب ہم اسلام آباد کے ہوائی اڈے سے اُس جانب محوئے پرواز ہوئے تو سب مسافروں کے چہروں پر ایک قسم کی خوشی اور جُستجو یانہ روش کے آثار دیکھے اور تھوڑی ہی دیر میں ہر کوئی قریبی کھڑکی سے باہر جھانکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ معلوم ہوا ہم نہ صرف دُنیا کی سب سے بڑی مملکت کی جانب رواں دواں ہیں بلکہ ساتھ ہی ساتھ دُنیا کی بُلند ترین چوٹیوں کے اوپر سے گزر رہے ہیں۔ ہر کسی کی زبان پر ننگا پربت۔ گڈوِن آسٹن۔ مَشا بروم اور نہ جانے کیا کیا نام تھے۔ اِسی خطے کو ہی تو بامِ دُنیا کہا جاتا ہے۔ لیکن اِن رِفعتوں نے دونوں ممالک کے درمیان پیار کے رشتے اِستوار کرنے والوں کے راستے قطعاً مسدود نہیں کئے۔ ماضی بعید میں فاہیان، ہیوان سانگ اور دیگر راہ نوردانِ شوق نے اِن سلسلہ ہائے کوہ کی رُکاوٹوں کو کوئی اہمیت نہیں دی تو آج تو تجارتی قافلوں کے سفر کو آسان بنانے کے لئے جدید شاہراہِ ریشم نے مزید آسانیاں مُہیا کر دی ہیں۔

مارکسی فلسفے کی روشنی میں تو مذہب کو ایک نشہ آور دوا سمجھا جا رہا تھا۔ اور یوں مذہبی عبادات کو کُھلے عام ادا کرنے پر قدغن تھی۔ اِتفاق سے یہ حج کا موسم تھا اور پاکستانی حکومت نے چینی مسلمانوں کو شاہراہِ ریشم کے راستے اسلام آباد آکر مناسکِ حج ادا کرنے کے لئے سعودی عرب جانے کے لئے سہولیات فراہم کرنا شروع کر دی تھیں۔ جوں ہی ہماری پرواز بیجنگ کے ہوائی اڈے پر اُترنے کے لئے بُلندی سے سطحِ زمین کے قریب آئی اور زمین پر لوگوں کی حرکات وسکنات نظر آنے لگیں۔ ہماری حیرت زدہ آنکھوں نے ایک کُھلے میدان میں ایک گروہ کو باقاعدہ باجماعت نماز پڑھتے دیکھا۔ معلوم ہوا عظیم رہنما ماؤزے تنگ کی وفات اور اُن کے بعد کے ثقافتی

انقلاب کے نتائج سے عُہدہ برآ ہونے کے بعد نئے رہنما ڈینگ زیاؤ پینگ کی قیادت میں عوامی جمہوریہ چین ایک نئے اِقتصادی اور سماجی ایجنڈے پر چل پڑا ہے اس نئی سوچ کے مطابق مذہبی اور ثقافتی روایات کے اِظہار کو بخوبی برداشت کیا جارہا ہے۔ ساری قوم اب اپنے اِرد گرد ہونے والے عالمی ماحول سے کما حقہ باخبر ہونے کی کوشش کر رہی ہے۔ جوان نسل تو انگریزی زبان وثقافت کو سیکھنے کے لئے بڑی بے قرار نظر آرہی تھی۔ نئے قواعِد کے مطابق اب ذاتی سرمایہ کو بھی قدر کی نگاہ سے دیکھا جانے لگا تھا۔ ہمارے ایک چینی رفیق نے تو بڑے فخر سے ہمیں بتایا کہ اب وہ اپنے پُرانے ایک کمرے والے گھر کی بجائے دو کمروں کی رہائش گاہ خرید چُکا ہے۔

بیجنگ یوں تو صدیوں قدیم شہر ہے۔ جسکے لفظی معنی ''شمالی دارالحکومت'' بتائے جاتے ہیں۔ لیکن مختلف ادوار میں اِسے مختلف ناموں سے پُکارا جاتا رہا ہے۔ قدیم جِن خاندان کے حکمران اِسے ''ژانگ دُو'' کہتے رہے۔ منگولوں نے اِسے ''دادو'' پکارا جبکہ قبلائی خان نے اِسی شہر کو ''خان بالیق'' کے نام سے موسوم کیا۔ مشہور اطالوی سیاح مارکو پولو نے اِسے ''کیمبولاک'' لکھا۔ کچھ وقتوں میں اِسے ''شُنتیان'' اور ''بی پینگ'' یا ''پیکنگ'' کہا جاتا رہا۔ جب چین کا دارالحکومت جنوبی شہر ''نانجنگ'' بمعنی ''جنوبی دارالخلافہ'' بنا تو بیجنگ کو ''بی پینگ'' کہا گیا جس کے لفظی معنی ''شمالی اَمن'' بتائے جاتے ہیں۔ لیکن آخر کار ماؤزے تُنگ کی قیادت میں اِشترا کی فوج کی فتح کے بعد 31 جنوری 1949ء سے بیجنگ ہی نئے عوامی جمہوریہ چین کا صدر مقام ٹھہرا۔

آپ چین آئیں اور تاریخی دیوارِ چین نہ دیکھیں یہ تو ہو نہیں سکتا۔ لہٰذا بیجنگ کے شمال میں واقع ''بدَالنگ'' کے علاقے میں اِس طویل عظیم دیوار کا ایک حصّہ ہمیں بھی دِکھایا گیا۔ جو شہر کو شمال سے آنے والے خانہ بدوش حملہ آوروں سے بچانے کے لئے تعمیر کی گئی تھی اور سینکڑوں میلوں تک میدانوں اور پہاڑوں دونوں کے اوپر سے گزرتی جارہی ہے۔ اس کی چوڑائی۔ اونچائی۔ طرزِ تعمیر اور روشنی کیلئے آگ کے الاؤ کرانے کے لئے تعمیر کردہ مینار سب ہی کچھ تو انسانی عقل کو ورطہءِ حیرت میں ڈالنے کے لئے کافی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ چاند سے ایک ہی قابلِ پہچان چیز وہاں پر پہنچنے والے پہلے فضانوَرد نے دیکھی اور وہ یہی دیوارِ چین تھی۔ اس مقام پر آج سیاحوں کی آسانی کے لئے ہزاروں سیڑھیاں موجود ہیں اور ساتھ ہی سطح زمین سے پہاڑوں کے اوپر سے گزرتی ہوئی دیوار تک پہنچنے کے لئے بجلی سے کام کرنے والی لفٹ بھی موجود ہے۔ ہم نے اوپر جانے کے لئے اِسی لفٹ کا سہارا لیا لیکن واپسی پر سیڑھیاں استعمال کیں۔

اچھی بھوک لگی۔ میز بانوں نے بھی ایک عظیم الشان دعوت کا اہتمام کر رکھا تھا۔ یوں چینی کھانوں کے متعلق بھی بہت کہا جا سکتا ہے۔ خاص الخاص مہمان ہوں تو چینی روایتی ''مانچو'' اور ''ہان'' دور کی مکمل دعوت کا اہتمام کرتے ہیں۔ ہمیں اِس مقصد کے لئے ''پیکنگ ڈک ریستوران'' میں مدعو کیا گیا جہاں روایتی منڈرین سٹائل اَسّی (80) کورسز والی دعوت کھلائی گئی۔ ساتھ یہ بھی بتایا گیا کہ اب اِن کھانوں میں خاصی کمی کی جا چکی ہے۔ قِسم قِسم کے لذیذ اور کچھ بے مزہ طعام ہمارے سامنے آتے رہے۔ کچھ میٹھے اور کچھ نمکین۔ ترتیب کچھ بھی ہوسکتی تھی۔ ساتھ ہی ساتھ چینی، روسی اور بین الاقوامی مشروبات کے دور بھی چلتے رہے۔ آخر میں جب پیکنگ کی مشہور روسٹ بطخ آئی تو اُس وقت تک سب کی اِشتہا تقریباً ختم ہو چکی تھی۔ کہتے ہیں کہ مانچو حکمران اِسی طرح کی سینکڑوں مختلف کھانوں پر مشتمل دعوت اُڑانے پر ہی اِکتفا کیا کرتے تھے۔

ہم نے بیجنگ کی مشہورِ زمانہ ''اوپیرا'' (جنگ جو) بھی دیکھی۔ جو یہاں کی ثقافتی زندگی کا ایک لازمی حصّہ تصور کی جاتی ہے۔ یہاں ساری کہانی حرکات وسکنات اور ساز و آواز کی مرہونِ منت ہوتی ہے۔ بازیگری کے کمالات بھی ساتھ ساتھ دیکھنے کو ملتے ہیں۔

اِس عظیم شہر کی عمارات کو تین حصّوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک کو آپ قدیم شاہی طرزِ تعمیر کہہ سکتے ہیں جسکی مِثال ''تیان مِن اسکوائر'' ہے جو اپنی وسعت اور شان سے پہچانی جا سکتی ہیں۔ پھر پچاس کے عشرے میں روسی طرزِ تعمیر سے متاثر ہو کر اِشتراکیوں کی طرزِ تعمیر ہے جس میں عمارتیں ڈربہ نما اور بھدی سے نظر آتی ہیں اور تیسری قِسم جدید تجارتی عمارات ہیں جو کئی منازل پر مشتمل ہوتی ہیں۔ یہ سب عمارتیں اُن ڈیڑھ ارب لوگوں کو رہائش مہیا کرتی ہیں جو اس بڑے شہر میں بستے ہیں۔

آج تو یہ شہر ڈبہ نما کثیر منزلہ عمارات پر سراسر مشتمل نظر آتا ہے۔ لیکن کہتے ہیں کسی زمانے میں یہاں کے باسی زمین پر محض ایک منزلہ پُرسکون گھروں میں رہا کرتے تھے جن کے ساتھ صحن اور باغ بھی ہوا کرتے تھے۔ یہ قصّہء ماضی اب تمام ہوتا جا رہا ہے لیکن ہمارے وہاں جانے تک ایسے ''ہوتو نگ'' کہیں کہیں اب بھی نظر آئے۔ ہمارا دل چاہا کہ اس انمول ماضی کی بھی ایک جھلک دیکھی جائے۔ لیکن ہماری اِس خواہش کے باقاعدہ اِظہار سے پہلے ہی ہمارے میز بانوں نے ایک ایسی ہی رہائش گاہ پر ہمیں مدعو کرایا اور وہاں کی مہمانی کا بھی ہمیں شرف حاصل ہوا۔ شاید اِس سیارے پر بڑھتی ہوئی آبادی کے تناظر میں نسلِ انسانی کا مستقبل یہی ہے کہ ہماری مستقبل کی نسلیں

اپنی راتیں بلندی پر واقع دڑبوں میں گزاریں گی اور دِن سکائی سکریپرز میں واقع دفاتر میں یا نہ ختم ہونے والی سڑکوں پر دوڑتی ہوئی اَن گنت سواریوں کی گود میں۔ اِسی لئے تو چینیوں نے شہروں میں بسنے والے کنبوں پر ایک سے زیادہ بچوں کی پیدائش پر پابندی لگا رکھی ہے۔ہم نے ایک جگہ اپنی ترجمان خاتون سے اُس کے کُنبے کی تفصیل پوچھی تو ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے فرمانے لگی۔''خوابوں میں چار بچے لیکن حقیقت میں صرف ایک''۔

بیجنگ کے ہوائی اڈے پر اُترتے ہی ہم نے اپنی کرنسی بدلوانے کے لئے دی تو ہمیں آر۔ایم۔بی (چینی کرنسی) کے خصوصی یُو آن دیئے گئے جِن میں ہر یُو آن کی قیمت ایک امریکی ڈالر کے برابر تھی۔ معلوم ہوا کہ سب آنے والے غیر ملکیوں کو یہی کرنسی لینے اور استعمال کرنے کی اجازت ہے کیونکہ اصل چینی یو آن کی تجارتی قیمت خاصی کم ہے۔اور پھر یہ خصوصی ''یُو آن'' واپس جانے سے پیشتر ہوائی اڈے پر بدلوانے پڑتے تھے۔آج تو بیجنگ کے ''وانگ فوجنگ'' جیسی جدید مارکیٹیں عالمی تجارت کے لئے مِثالی بازار سمجھے جاتے ہیں لیکن اُن دِنوں ''فرینڈ شِپ سٹورز'' ہی غیر مُلکی سیاحوں کی ضروریات پوری کرتی تھیں۔ وہیں جا کر ہم نے بھی کچھ چینی مصنوعات بشمول لاجواب کراکری کے سیٹ خریدے۔

1987ء کا بیجنگ ابھی اُس مِثالی صنعتی ترقی سے کوسوں دور تھا۔اور ابھی ماحولیات کے مسائل کا شکار ہونے سے بھی محفوظ تھا۔ابھی ابھی تو سڑکوں پر گیس اور تیل سے چلنے والی سواریوں کی تعداد کچھ کچھ بڑھنے لگی تھی اور لاکھوں بائیسکلوں کی تعداد میں کمی آ رہی تھی۔عظیم رہنما ماؤزے تنگ کی قیادت میں چالیس برس تک اِشترا کی فلسفے پر عمل پیرا رہنے کے بعد ایک بہت بڑی قوم اتحاد و تنظیم کا درس سیکھ چُکی تھی۔ اِجتماعی سوچ اِس کی رَگ وپے میں سما چکی تھی۔اب یہ مخلوقِ خُدا قومی مفاد میں زمانہ حال کے جدید ترقی پسند مُلکوں سے مسابقت حاصل کرنے کے لئے بےتاب تھی۔سو یوں ہم نے ڈاکٹر اقبال کے الفاظ میں گِراں خواب چینیوں کو سنبھلتے بلکہ دیگر کم خوش نصیب قوموں کی قیادت سنبھالنے کی تیاری کرتے ہوئے دیکھا۔

ہم نے چینی بازیگروں، چینی ریستورانوں اور چینی طریقہ علاج کے متعلق بہتیرا سُن رکھا تھا لیکن یہ تو بیجنگ جا کے معلوم ہوا کہ اِن لوگوں نے فراعنۂ مصر کی طرح اپنے عظیم قائد کے جسدِ خاکی کو رہتی دُنیا کے لئے تیِنان مِن چوک کے پہلو میں ایک پُرشکوہ مقبرہ میں رکھ دیا ہے۔لیکن اُن کے فلسفے سے کچھ کچھ انحراف کے پہلو بہ پہلو اُن کی طرف سے توجہ بھی اب بھٹک رہی تھی۔ بہر حال ہم نے بیجنگ میں واقع ماضی کے شاہی دور کے کئی ایک محلات بھی دیکھے جن میں شہرِ ممنوع (فاربِڈن سِٹی)، گرمائی محل (سَمر پیلس)، خانقاہ فردوس (ٹیمپل آف

ہَیوَن)،مرکزِشہراورمرکزِ نگاہ ’’تیان مِن اسکوئر‘‘ اور اِس کا ’’دروازہءِ امنِ فردوس‘‘ شامل تھے۔ شہرِممنوع مِنگ اور قِنگ بادشاہوں کے دور میں اُن کے محلات کے طور پر استعمال ہوتا رہا اور اِس کے اکثر حصّے 1406ء سے 1420 عیسوی کے دوران تعمیر ہوئے۔ تیان مِن جسے مملکتِ چین کے ریاستی نشان کے طور پر بھی پیش کیا جاتا ہے وہ مِنگ دور میں 1651 عیسوی کے لگ بھگ تعمیر کیا گیا۔ چین کے موجودہ حکمرانوں کی بستی تیان مِن کے شمالی سِمت واقع ’’ژونگنانئ‘‘ کہلاتی ہے۔ مگر طاقت کا اصل سرچشمہ تو ’’گریٹ ہال آف دی پیپلز‘‘ ہے جہاں دُنیا کی اس 22% آبادی والے سب سے بڑے مُلک کے عوامی نمائندے قانون سازی کرتے ہیں۔

چین ایک عظیم الشان تہذیب وثقافت کی آماجگاہ ہے۔ آج یہ نہ صرف ایک عالمی فوجی طاقت ہے بلکہ اِقتصادی اور صنعتی ترقی میں بھی کسی دوسرے مُلک سے پیچھے نہیں ہے۔ اِس کا صحیح اندازہ تو ہمیں اُس وقت ہوا جب دو برس بعد ریاست ہائے متحدہ امریکہ جا کر ہم نے وہاں کے بازاروں میں بڑے چھوٹے سب ہی خرید و فروخت کے مراکز کو چینی مصنوعات سے لدا پھندا پایا۔ بیجنگ میں تو ہم نے اِس عظیم قوم کے ماضی کے شاہی دور میں قائم کردہ بڑی بڑی افواج کے مجسمے دیکھے جو ہمارے ہوٹل کے قریب واقع ایک فوجی عجائب گھر میں سجائے گئے تھے۔ ہزاروں فوجیوں پر مشتمل مختلف ادوار سے متعلق خوشنما وردیوں میں ملبوس یہ ننھے ننھے مٹی کے پیکر اِس بات پر گواہ تھے کہ ہر دور میں بقولِ ایک چینی ضرب المثل کے ’’سیاسی طاقت کی بقاء توپ کے گولے میں مُضمر ہے‘‘۔ ماؤزے تنگ کی سُرخ فوج نے اسی پس منظر میں اپنے وجود کو بطریقِ اَحسن منوایا۔

جہاں تک ہماری ایشیا پیسفک پوسٹل یونین کے سالانہ اجلاس کا تعلق تھا۔ اُس کے متعلق اتنا ہی کہا جاسکتا ہے کہ چینی وزیرِ مواصلات کے نائب نے اِس کا افتتاح کیا اور پھر وزیرِ مواصلات نے اِس کے اِختتامی اجلاس میں شرکت فرما کر اِس خطّے میں واقع دوسرے ممالک کی پوسٹل سروسز کی متعارف کردہ نئ سہولیات کو خراجِ تحسین پیش کیا کیونکہ اُس وقت تک چین کی اپنی اندرونِ مُلک ڈاک کا معتد بہ حصّہ ذاتی یا تجارتی ڈاک کی بجائے مطبوعہ مواد اور اِشتراکی فلسفہ کی اِشاعت اور اِخبارات ورسائل کی تقسیم پر ہی مشتمل ہوتا تھا اور یوں ڈاک کا شعبہ اِشتراکی پروپیگنڈا گھر گھر پہنچانے میں خاصا موئثر کردار ادا کرتا تھا۔

جزیروں کی مالا:۔

بحرِ ہند کے گہرے پانیوں میں سری لنکا کے جنوب میں خطِ استوا تک بلکہ اُس پار بھی بڑے چھوٹے

بے شمار جزیروں کا ایک سلسلہ پھیلا ہوا ہے۔ یہ بارہ سو کے لگ بھگ جزیرے ہوائی جہاز کی بلندیوں سے اپنے صدر مقام ''مالے'' کے گلے میں پڑے پھولوں کی ایک خوبصورت مالا کی صورت میں نظر آتے ہیں۔ یہ جزائر مالدیپ ہیں۔ یہاں کے باشندے یوں تو انتہائی پُرسکون زندگی بسر کرتے معلوم ہوتے ہیں لیکن اُن کے ساتھ مستقبل کے اندیشہ ہائے دور دراز میں یہ فکر دامن گیر ہے کہ اگر قُطبین پر برف پگھل گئی تو اُن کی یہ خوبصورت دھرتی ہمیشہ کے لئے سمندر کی آغوش میں چلی جائے گی۔ یہ دورِ حاضر کی پریشانی اُن قدرتی تبدیلیوں کی مرہونِ منت ہے جنہیں ''گرین ہاؤس ایفیکٹ'' کہا جاتا ہے۔ لیکن کہتے ہیں کہ صدیوں پہلے بھی یہاں کے معصوم باسیوں کو بحرِ ہند کی غضب ناک موجیں اکثر تنگ کرتی رہتی تھیں۔ اِس توہم پرست مخلوق کا یہ خیال تھا کہ سمندر جب بپھر جائے تو سمندر دیوتا اِنسانی جان کی قربانی مانگتا ہے لہٰذا ایسی حالت میں یہ لوگ ایک عدد دوشیزہ کو اوائل شب سمندر کے حوالے کر دیا کرتے تھے۔ صبح دیکھتے تو وہ معصوم روح ساحل پر مُردہ پائی جاتی۔ آخر ایک مراکشی بزرگ نے ساتویں صدی میں آ کر اِس بے ہودہ رَسم سے ان کی جان خلاصی یہ کہہ کرادِی کہ بجائے دوشیزہ کے اُن بُزرگ کو ہی اندھیری رات میں موت کے دیوتا کے حوالے کر دیا جائے۔ پھر کیا تھا۔ وہ حضرت ساری رات عبادتِ خداوندی میں مصروف رہے۔ صبح جب جزیرے والوں نے جا کر اُن پر ڈالی گئی چادر اُٹھائی تو اندر سے ایک مطمئن روح کو اِن لوگوں کی سادہ لوحی پر ہنستا مُسکراتا پایا۔ یوں اُن بزرگ کی دعوت وتبلیغ کی بدولت اِسلام اِن جزائر کے باسیوں کا دین ومذہب قرار پایا۔

مالدیپ ہمیں پہلی دفعہ مارچ 1988ء میں سارک ممالک میں پوسٹل تکنیکی کمیٹی کے اجلاس کے سلسلے میں جانا پڑا۔ چونکہ راستے میں سری لنکا میں ایک رات ٹھہرنا تھا لہذا ''کولمبو'' شہر کو جی بھر کر دیکھا۔ سری لنکا پوسٹ کے مسٹر ڈی سِلوا اِس سلسلے میں ہماری رہنمائی کرتے رہے۔ کہتے ہیں کہ جب حضرت آدمؑ خُلدِ بریں سے نکالے گئے تو فرشِ زمیں پر اُن کا پہلا ٹھکانا یہی جزیرہ ٹھہرا۔ اس واقعہ یا سانحہ کی یاد میں اِسی مُلک میں واقع ''پُلِ آدم'' کی نشان دہی کی جاتی ہے۔ خیر بعد میں تو اُنہیں اور اُن کی اولاد کو خلافتِ ارضی کی ذمہ داریاں نبھانی پڑیں۔ کولمبو کا ساحلِ سمندر، قصرِ صدارت، نوآبادیاتی دور کی کثیر المنزلہ عمارتیں، چڑیا گھر، مہاتما بُدھ کے قوی ہیکل مجسمے اور لذیذ پھلوں کی مارکیٹیں دیکھنے ہر طرف جانے کا اِتفاق ہوا۔ یہاں کے اَنناس تو بہت ہی بھلے لگے لہذا واپسی پر اِس سوغات کے چند نمونے ساتھ لے جانے کا عندیہ ہم نے اپنے گائیڈ کو دے دیا۔ ہماری خواہش پر وہ ہمیں ہمارے

دوست سری لنکا پوسٹ کے سابق پوسٹماسٹر جنرل ''گروگے'' کے گھر بھی لے گیا۔ہم نہ صرف اُس تیز رفتار انگریزی بولنے والے سابقہ نامہ بر کی میزبانی سے مستفید ہوئے بلکہ اُن کی رہائش گاہ کی بناوٹ وسجاوٹ کی دِل کھول کر تعریف وتوصیف کئے بغیر نہ رہ سکے۔مسٹر ڈی سِلوا مُلک مُلک کے سکّے جمع کرنے کا شوق پالے ہوئے تھے۔لہٰذا ہم جب بھی کولمبو سے گزرتے اُن کی ہتھیلی پر پاکستان میں چلنے والے رائج الوقت سکّے تھما دیتے۔

کولمبو سے گھنٹہ ڈیڑھ کی بجانبِ جنوب پرواز پر جب ہمارے جہاز نے نیچے کی طرف اُترنا شروع کیا تو ہمیں ان کالے پانیوں میں بے شمار خُشکی کے ٹکڑے نظر آنے لگے۔تقریباً سب ایک ایک گول چکر میں واقع تھے۔یہ مجمع الجزائر ''ایٹول'' کہلاتے ہیں۔جو مالدیپ کی انتظامی اِکائی شمار ہوتے ہیں۔جہاز آخر ایک چھوٹے سے جزیرے پر اُتر گیا۔یہاں کا ہوائی مُستقر ہمارے شہر کے اُس وقت کے گورنمنٹ ٹرانسپورٹ سروس کے لاری اڈے سے بھی چھوٹا نظر آیا۔ہمارے استقبال کے لئے آنے والے افسر نے بتایا کہ یہاں سے آگے ہمیں دُخانی کشتی سے مُلک کے دارالحکومت ''مالے'' جانا ہے۔ہم نے کہا ''بسم اللہ'' اور اُن کے ساتھ سٹیمر کی جانب ہو لئے۔جو ہمیں اپنی منزل پر لے چلا۔اس عظیم سمندر کے سینے پر ایک چھوٹے سے سٹیمر سے سفر کرنے کا تجربہ ہمیشہ یاد رہے گا۔ہمارے گائیڈ اپنے ہاتھ میں لاسِلکی کا آلہ لئے ہماری پیش قدمی کی اطلاع گھڑی گھڑی کسی کو دیتے رہے۔

مالے پہنچے تو اُترتے ہی وہ ہمیں ہمارے ہوٹل میں لے گیا۔یہ چھوٹا سا ہوٹل زیادہ تر لکڑی سے تعمیر کردہ تھا۔ہمیں بتایا گیا کہ اِس پائے کا ایک ہوٹل اور بھی اس شہر میں موجود ہے۔جہاں ہمارے دوسرے ساتھی جو دوسرے سارک ممالک سے آئے ہیں قیام پذیر ہوں گے۔ابھی ہم نے اپنے ہوٹل میں سامان رکھا ہی تھا کہ کمرے میں پڑے ہوئے ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ہم نے اُٹھایا تو معلوم ہوا کہ سفارتِ پاکستان سے کوئی اشرف صاحب ہمیں مِلنے آرہے ہیں۔ابھی ہم اپنے جوتے کے تسمے کھولنے میں مصروف تھے کہ اشرف صاحب نے دروازہ کھٹکھٹایا۔فرمانے لگے ''کیا ہی اچھا ہوا گر آپ یہ تسمے دوبارہ کَس لیں کیونکہ سفیرِ پاکستان آپ کی راہ دیکھ رہے ہیں''۔''ارے کہاں'' ہم نے پوچھا۔''سفارت خانے میں''۔وہ بولے۔لیجئے ہم سفارت خانے کی جانب نکل پڑے۔ہوٹل کے استقبالیہ سے اشرف صاحب نے ٹیکسی سٹینڈ پر فون کیا۔وہاں سے معلوم ہوا کہ ہمارے لئے ٹیکسی آنے میں دس منٹ لگیں

گے۔''اس دوران تو ہم سفارت خانے پہنچ جائیں گے''۔ اشرف صاحب بولے۔ اُس نے یوں بھی کینوس کے جوتے پہنے ہوئے تھے۔ ہمیں ساتھ چلنے کو کہا۔ ہوٹل سے باہر نکلے تو معلوم ہوا یہاں کسی سڑک پر تارکول نہیں ہے اور نہ ہی ضرورت محسوس ہوتی ہے اور نہ ہی کوئی پٹرول یا گیس سٹیشن نام کی کوئی شے موجود ہے۔ اور مزے کی بات یہ کہ یہاں کسی سڑک کا کوئی نام نہیں۔ البتہ رہائش گاہوں کے اپنے اپنے نام ہیں۔ٹیکسی پر جانا ہو تو ڈرائیور کو گھر یا دفتر کا نام بتایا جاتا ہے۔

مالے کا کل رقبہ ایک مربع میل ہے۔ لہٰذا ہر کوئی یہاں کے سارے جغرافیہ سے واقف ہوتا ہے۔ ویسے جمہوریہ مالدیپ کی کُل آبادی کا ستر فیصد مالے ہی میں رہائش پذیر ہے۔ مالدیپ روانہ ہونے سے پہلے ایک روز ہم اسلام آباد میں وزارتِ خارجہ گئے تو متعلقہ افسر نے بتایا کہ مالے میں واقع سفارتِ پاکستان کی جانب سے وزارت کو ایک عدد سٹیمر مہیا کرنے کی استدعا کی گئی ہے تاکہ سفیر صاحب اُس کے ذریعہ مختلف جزائر کا دورہ کرسکیں کیونکہ اُن کو مہیا کردہ مرسڈیز کار اِس سلسلے میں کسی کام کی نہیں۔ ویسے مالے میں اُس وقت تین یا چار سفارت خانے کام کر رہے تھے یعنی پاکستان، بھارت، سری لنکا اور شاید برطانیہ یا آسٹریلیا کا۔ اور محض دو عدد مرسڈیز کاریں اِس مُلک کی سڑکوں پر چلا کرتی تھیں۔ ایک صدرِ جمہوریہ جناب مامون عبدالقیوم کی اور دوسری جناب سفیرِ پاکستان مظہر قیوم کی۔ اتفاق سے ہماری موجودگی کے دوران ہمارے سفیر صاحب کی یہ گاڑی خراب تھی اور اِسے مرمت کے لئے بحری جہاز سے سنگاپور بھیجا گیا تھا۔ ویسے سفارت خانے کے لوگوں کے لئے پینے کا پانی بھی بوتلوں میں سنگاپور سے ہی درآمد کیا جاتا تھا۔ مالے کے کنوؤں کا پانی کھارا اور نمکین ہوتا تھا اور عوام الناس چھتوں پر برسنے والے پانی سے ہی اپنی پیاس بجھاتے تھے۔

مالدیپ میں خواندگی کا تناسب پڑوسی مُلک سِری لنکا کی طرح خاصا بُلند ہے۔ سکولوں میں اساتذہ بھی عموماً سری لنکا کے باشندے ہوتے ہیں۔ لہٰذا ساری آبادی اُن ہی کے تلفظ کے ساتھ انگریزی بولتی ہے۔ ویسے تو دفاتر اور کاروباری مراکز میں خواتین بڑھ چڑھ کر مرد حضرات کا ہاتھ بٹاتی ہیں لیکن طلاق یافتہ خواتین کا تناسب بھی کافی زیادہ ہے۔ اور یوں طلاق اور ٹوٹتے اِزدواجی رِشتے ہمارے ہاں کے برعکس کوئی سماجی داغ نہیں گردانے جاتے۔ سرکاری طور پر مالے کو خالص اِسلامی اَقدار کا شہر برقرار رکھنے کی ہر کوشش کی گئی ہے۔

غیر مُلکی سیاحوں کے غول کے غول جہاز بھر بھر کر اِن جزائر میں آتے ہیں لیکن اُن سب کو دوسرے جزائر میں یہاں کے انمول قدرتی مناظر دیکھنے کے لئے ہوائی اڈے سے سیدھا روانہ کر دیا جاتا ہے جہاں اُن کے لئے چار اور پانچ ستارہ ہوٹل اور ہر قسم کی سہولیات اور لوازمات موجود ہوتے ہیں۔ مگر مالے کے باشندے بالعموم اُن عیش کدوں کو دیکھنے سے محروم ہیں۔

مالدیپ کے پانیوں میں آخر کیا ہے جسے دیکھنے کے لئے یورپ، امریکہ اور دیگر ممالک سے سیاح کھنچے کھنچے چلے آتے ہیں۔ اِس کے لئے ہمیں ایک قریبی جزیرہ ''کروبا'' لے جایا گیا۔ سٹیمر سے اُترتے ہی ساحل پر ہمیں وہ منظر نظر آیا جس کی حُسن و رعنائی اور عجیب وغریب ہونے میں دو کلام نہیں ہو سکتے۔ یہاں پر سمندر کا پانی اِتنا شفاف پُرسکون اور نتھرا ہوا دکھائی دیتا ہے کہ اس کی اتھاہ گہرائیوں میں بسنے والی ساری آبی مخلوق آپ کو بالکل صاف نظر آتی ہے۔ یہ ایسا منظر ہوتا ہے کہ دیکھنے والا دَم بخود رہ جاتا ہے اور اُس بزرگ و برتر صانعِ لَم یَزل کی کاریگری کا مُعتقد ہو جاتا ہے۔ یہیں سے کوسوں دور نظر آنے والا ایک اور منظر بھی ہم نے دیکھا۔ یوں لگتا تھا جیسے سمندر کا شفاف اور بے رنگ پانی ایک آبشار کی طرح گہرائی میں اُتر رہا ہے۔ معلوم ہوا یہ سارے جزائر مونگے کی چٹانوں پر اِستوار ہیں اور اِن پانیوں میں اس قِسم کی اونچ نیچ عام سی بات ہے۔

اُسی سال کے ماہ ستمبر میں ہمیں دوبارہ ایشیا پیسفک پوسٹل یونین کے سالانہ اِجلاس میں شامل ہونے کے لئے مالدیپ جانا پڑا۔ اِس دفعہ ہم سفیرِ پاکستان جناب مظہر قیوم کی خصوصی دعوت پر اُن ہی کی رہائش گاہ پر اُن کے ذاتی مہمان بن کر ٹھہرے۔ مظہر صاحب دائمی کنوارے تھے مگر ایک اچھے اور مخلص میزبان تھے۔ ایک دِن تو اُنہوں نے ہمارے اِجلاس کے سب ہی مندوبین کو اپنے گھر کھانے پر مدعو کیا۔ لیکن افسوس کی بات یہ ہوئی کہ میزبان مُلک مالدیپ سے کوئی بھی مہمان سوائے ایک خاتون زُبیدہ ابوبکر کے شریک نہیں ہوا اگرچہ اِس سلسلے میں باقاعدہ دعوت نامے جاری کئے گئے تھے۔ غالبًا یہاں کے سماجی تعلقات کے معیار کچھ مختلف تھے۔

سفیر صاحب کے مالکِ مکان اِتفاق سے مالدیپ حکومت کے ایک وزیر تھے اور اُن کے پڑوس میں ہی رہتے تھے۔ عصر اور مغرب کے درمیان اُن کے گیٹ پر کوئی نہ کوئی کھڑا نظر آتا تھا اور وزیر موصوف کی اہلیہ محترمہ اُن سے ہم کلام نظر آتی تھیں۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ اِس چھوٹے سے

جزیرے کے مکانات میں کسی ڈرائنگ روم قسم کے تکلفات کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔میزبان اپنے مہمان کا استقبال دروازے پر ہی کرتا ہے اور مختصر سی گفتگو کے بعد دونوں میں جُدائی ہو جاتی ہے۔ بے کار کی چائے نوشی کا رواج ابھی یہاں مقبول نہیں ہوا۔

ایک روز ہم اپنی معمول کی کارروائی میں مصروف تھے کہ اِطلاع آئی کہ کوئی صاحب ہم سے ملنے آئے ہیں۔ہم نے ہال سے باہر نکل کر دیکھا تو اَدھیڑ عُمر کی ایک پُر وقار شخصیت ہم سے اپنا تعارف کرانے لگی۔ یہ صاحب اقوامِ متحدہ کی جانب سے مالدیپ میں شعبہ تعلیم کے لئے مشیر تھے۔اور پاکستان کی ایک یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہ چکے تھے۔اُنھوں نے ہم سے ہماری رہائش کا پوچھا تاکہ وہ کسی وقت بعد میں ہم سے مِل سکیں۔غرض شام کے وقت وہ سفیر صاحب کی رہائش گاہ پر تشریف لائے۔تعارف کے بعد سفیر صاحب نے اُن کی خیر خیریت دریافت کی۔ پروفیسر صاحب فرمانے لگے۔ ’’صاحب ہمارا تو یہاں کی حکومت نے خاصا خیال رکھا ہوا ہے۔اور وہ یوں کہ رہنے کو یہاں کے شان زی لیزا (فرانس کے شہر پیرس میں مرکزِ شہر) پر واقع ایک گھر فراہم کیا ہے اور آمد و رفت کے لئے سواری کا بھی خاطر خواہ انتظام کر رکھا ہے‘‘۔سفیر صاحب نے حیران ہو کر پوچھا۔’’یہاں کا شان زی لیزا کہاں ہے‘‘۔فرمانے لگے۔’’ارے شہر کے بیچوں بیچ گزرنے والی وہ کچی سڑک جس پر سب سے پہلے تارکول ڈالنے کی منصوبہ بندی کی جا رہی ہے‘‘۔سفیر صاحب مسکرائے اور پوچھا’’اور ٹرانسپورٹ کا کیا انتظام ہے؟‘‘۔بولے’’وہ بھی کافی معقول ہے۔ایک عدد سائیکل بمع سامان لانے لے جانے کے لئے کیریئر کے ہمیں مہیا کر دی گئی ہے‘‘۔سُبحان اللہ ایسے خوش باش اور خوش فہم بندگانِ خُدا سے آپ کی ملاقات اِس پُرسکون دارالحکومت کے علاوہ اور کہاں ہو سکتی ہے!۔

ایک دِن سفیر صاحب کو ہمیں گھر سے باہر ایک ریستوران میں مدعو کرنے کی سوجھی۔ اپنے مالدیپی ڈرائیور کو اِشارے کنائے سے سمجھایا کہ کہاں جانا ہے اور مرسڈیز کار میں بیٹھ کر ہم اُس کے ساتھ اپنی منزل کی جانب چل دئے۔گاڑی پر باقاعدہ پاکستان کا سبز ہلالی پرچم لہرا رہا تھا۔وہاں پُہنچ کر اُنھوں نے ڈرائیور کو واپس سفارت خانے جانے کے لئے کہہ دیا۔ہم نے پوچھا’’واپسی کیسے ہو گی؟‘‘۔فرمانے لگے۔’’پیدل واک کریں گے اور کیا؟‘‘۔ ریستوران کا کھانا واقعی عمدہ اور لذیذ

تھا۔ ہمیں بتایا گیا کہ یہ عمارت سابقہ شاہی خاندان کی ایک خاتون کی ملکیت ہے جس سے ایک برطانوی باشندے نے خرید کر یا کرایہ پر لے کر اِس میں مقامی نوجوانوں کو آدابِ میزبانی سیکھانا شروع کر رکھا ہے۔ اور واقعی نوجوان بچے بچیاں اچھے شاگرد نظر آئے۔

اور پھر ایک روز سفیر صاحب نے بتایا کہ اُس دِن ماحولیات کا عالمی دِن منایا جا رہا ہے۔ اِس سلسلے میں ایک دوڑ کا انتظام بھی کیا گیا ہے جس میں شہر کے سب لوگوں کے ساتھ ساتھ صدرِ جمہوریہ مامون عبدالقیوم بھی حصّہ لیں گے۔ دوڑ کا اِختتام قومی سٹیڈیم پر ہوگا جہاں تقاریر ہوں گی۔ لہٰذا ہم دونوں پھریرے والی گاڑی میں سیدھے سٹیڈیم پہنچے۔ تھوڑی دیر میں سارا شہر صدرِ جمہوریہ کی قیادت میں ہانپتے کانپتے وہاں پہنچا۔ صدر صاحب بھی سب دیگر شرکاء کی طرح نیکر اور بنیان میں ملبوس تھے جس پر موقع کی مناسبت سے الفاظ لکھے ہوئے تھے۔ صدر صاحب نے فرداً فرداً ہم سب غیر مُلکی مہمانوں سے ہاتھ مِلائے اور پھر قوم سے لاؤڈ سپیکر کے ذریعے خطاب فرمانے لگے۔ ''ماحولیاتی آلودگی کو روکنے کی کوششیں نہیں کرو گے تو ایک روز تمہارے جزیرے ڈوب جائیں گے''۔ خُدا بہتر جانتا ہے کہ اس ماحولیاتی آلودگی کے ذمہ دار بڑے بڑے صنعتی ممالک ہیں یا اِن جزیروں کے سادہ اور معصوم مچھیرے جِن کے بدن پر موسم کی مُناسبت اور غُربت و اَفلاس کے تناسب سے محض ایک عدد لنگوٹا تَن ڈھانپنے کو ہوتا ہے۔

ہمارے قیام کے آخری شب اِن مچھیروں میں سے کچھ کو مدعو کیا گیا تھا تا کہ ہم غیر مُلکی مندوبین کے سامنے اپنے روایتی گیتوں کے گانے اور بے سُرے آلاتِ موسیقی کے استعمال کا مظاہرہ کر سکیں۔ لیکن ہمارے آسٹریلیا، نیوزی لینڈ اور جاپان جیسے مقابلتاً بڑے جزیروں سے آئے ہوئے مندوبین نے یہاں بھی اپنی خرمستیوں کے اِظہار کا موقع ضائع نہیں کیا۔ اور مقامی البیلی جوانیوں نے اُن کا بھرپور ساتھ دیا۔